نہین سمجھی گئین، لیکن زیر تبصرہ رسالہ مین مصنف کی کوششون نے حیرت انگیز طور پر ہماری توجہ اپنی جانب مائل کرلی مصنف نے اس رسالہ مین بارش کے متعلق جدید سائنٹفک تحقیقات کی قرآن مجید کی آیتون سے مطابقت دکھائی ہے، اور اوّلاً سائنٹفک طور پر مانسون، بخارات اور بارش وغیرہ کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے، اس کا متن پیش کیا ہے، اور پھر اسی کے پہلو مین قرآن کی ایسی آیتون کا محض لفظی ترجمہ درج کیا ہے، جس مین بارش، ہوا، اور ابر وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے، اور آخر مین بارش کا قرآن مجید مین مختلف موقعون پر استعمال، اور قرآن کا بارش، ابر اور ہوا وغیرہ سے ذات باری تعالیٰ پر استدلال لانا دکھایا ہے، اگرچہ ہمین کہین کہین مصنف کی رائے سے اتفاق نہین ہوا، مثلاً "سحاب مسخر" وغیرہ کی تشریح مین، تاہم رسالہ کے مباحث دیکھنے سے مصنف کے ذہن رسا کی تعریف اور اسکی کوششون کی داد دینی پڑتی ہے، امید ہے کہ وہ اسی انداز مین اپنی تحقیقات کو جاری رکھین گے، جزاک اللہ خیرا،

اسلامی تعلیم - از مولوی مفتی سید محمود صاحب، ناشر جناب عزیز حسن بقائی، اڈیٹر رسالہ پیشوا، کوچہ چیلان دہلی، ۵۵ صفحے، کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت:- ۶/

اس مین اسلام کے عقائد و عبادات وغیرہ کے مسائل سوال و جواب کے طرز پر لکھے گئے ہین، کتاب کے جو اوراق نظر سے گذرے، اُن مین مسائل کے جوابات کو قرین صواب پایا، تاہم ایک آدھ جگہ فقہ کے عمومی فتوی سے بعض جوابات مختلف نظر آئے مثلاً موجودہ زمانہ کی یہودیہ و نصرانیہ سے نکاح کا جائز نہ ہونا (ص ۴۸) وغیرہ، کتاب کے آخر مین قرآن مجید و احادیث کے مسلسل و مرتب اردو ترجمون سے اسلامی اخلاق کی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، کتاب کی ترتیب متداول فقہی ابواب پر ہے،

الطریقۃ المرضیہ فی التمرینات النحویہ، از مولوی حکیم محمد احمد صاحب معلم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظمگڈھ حجم ۲۲ صفحے،

عربی خوان طلبہ کو علم نحو کی مشق کرانے کیلئے یہ مختصر رسالہ ترتیب پایا ہے، مصنف کہنہ مشق مدرس ہین، سالہا سال اس طریقہ تعلیم کا عملی تجربہ کیا ہے، امید ہے کہ یہ رسالہ طلبہ کے لئے مفید ہوگا، اور عربی کے ابتدائی طالب العلم اس سے پورا فائدہ اٹھائینگے،

"ر"

جلد ۳۱ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۳ء | عدد ۴

مضامین

شذرات

پروفیسر رشید صدیقی صاحب کی طلب اور اصرار پر اڈیٹر معارف نے ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو مسلم یونیورسٹی کی انجمن اردوے معلی مین ہندوستان مین ہندوستانی پر ایک خطبہ پڑھا، جلسہ کی صدارت نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی نے فرمائی، گو لوگ دو روز پیشتر سے حسین رؤف بے کے استقبال و آمد اور جلسون کی بھرمار سے تھکے تھے، تاہم یونین کا ہال پورا بھرا تھا، معلومات کے لحاظ سے تو یہ خطبہ چندان اہم نہ تھا لیکن اپنے اصلاحی مشورون کے لحاظ سے بہت زیادہ دلچسپی سے سنا گیا جنمین سب سے اہم بحثین یہ تھین، "قومیت کی تکوین مین زبان کا درجہ" اور "مسلم یونیورسٹی مین تعلیم کی زبان" طلبہ کی طرف سے ان دونون تجویزون کا خیر مقدم جس گرمجوشی سے کیا گیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی اپنے تعلیمی انقلاب کا اعلان کرے،

اس خطبہ مین ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ہم کو اپنی اس زبان کی اشاعت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آیندہ اسکو اردو کے بجاے "ہندوستانی" کے نام سے پکارین، اردو ایک نئی اصطلاح ہے جس کی عمر تو ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہین اور جسمین کسی قسم کی وطنی و قومی جذبہ کی جھلک نہین، اور نہ تمام ملک کی وسعت کے تعلق کا اس لفظ سے اظہار ہوتا ہے برخلاف اس کے ہندوستانی جو اسکا صحیح ترین نام ہے، ان تمام جذبات اور خیالات کو حاوی ہے،

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زبان کا "ہندوستانی" نام انگریزون کا بخشا ہوا ہے، خطیب نے تاریخی حوالون سے اسکو ثابت کیا کہ یہ قطعی غلط ہے، اور کم از کم دسوین صدی کی تاریخون مین انگریزون کے اثر سے بہت پہلے اس زبان کا یہ نام پڑ چکا تھا،

اس خطبہ کا ایک فقرہ جسپر اس ہال مین سب سے زیادہ پسندیدگی کا اظہار کیا گیا یہ تھا کہ "یہ درسگاہ مسلمانون کی نگاہ امیدون کا قبلہ رہی ہے، اور اب بھی صدیون تک رہ سکتی ہے، صرف شرط اتنی ہے کہ وہ اپنا رخ مغرب سے پھیر کر مشرق کی طرف کر لے، اور ہر چیز کو دوسرون کی نظر سے دیکھنے کے بجائے وہ اپنی نظر سے دیکھے"،

یہ پورا خطبہ آیندہ یونیورسٹی کے میگزین مین شائع ہوگا،

علی گڈھ یونیورسٹی مین میری دوسری تقریر آفتاب ہوسٹل کے طلبہ کے سامنے ہوئی، یہ نیا ہوسٹل صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے نام پر انکے دوستون اور عزیزون، اور کالج کے پرانے طالب علمون کے چندون سے بنا ہے، اسکی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ منتظمین نے یہ طے کیا ہے کہ علی گڈھ کے دوسرے دار الاقامون کے برخلاف اسمین ہر چیز مین سادگی اور کفایت شعاری ملحوظ رکھی جائے یہانتک کہ یہان کے کھانے کی فیس صرف چھ روپیے مقرر کی ہے، بالفعل اسمین اسی لڑکون کے قریب ہین، کوشش ہے کہ یہ دار الاقامہ دوسرے دار الاقامون کے مسموم اثرات سے حتی الوسع محفوظ رہے،

یہان کے طلبہ کے سامنے جو تقریر کیگئی، اسمین سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی کیساتھ اس جد وجہد اور جانکنی سے بھری ہوئی زندگی کا نمونہ پیش کیا گیا جسکے بغیر مسلمان طلبہ اپنی روزمرہ کی زندگی مین ناکام رہتے ہین، اور بتایا گیا کہ مذہب کا ذکر چھوڑیئے خود علوم جدیدہ کی تحصیل و تکمیل مین اگر انگریزی زبان کو الگ کر دیا جائے تو ہم نے کونسی اچھی مثال اب تک پیش کی ہے، اور ہماری یہ زندگی جو تمامتر دوسری قوم کی نقالی پر مبنی ہے، کہانتک ہمارے اندر قومی روح کی سرگرمی پیدا کر سکتی ہے؟

اسی کے بعد دوسری تقریر طبیہ کالج کے ہال مین ہوئی، اس طبی کالج کے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا، کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بٹ صاحب نے مہربانی فرما کر کالج کے ایک ایک شعبہ کو دکھایا، خوشی ہوئی کہ ہماری قدیم طب کو بھی اس "مہجورستان" مین زندگی کا موقع مل رہا ہے، حکومت نے جب سے جا بجا دیسی طب اور ویدک کی طرف توجہ کی ہے ملک مین جا بجا طبی اسکول کھل رہے ہین، جہان ایک طرف یہ خوشی کا موقع ہے، وہین دوسری طرف یہ افسوس ہے کہ ان طبی درسگاہون مین طالب علمون کے قبول کرنے کا معیار بہت ہلکا رکھا گیا ہے، یہان جو تقریر کیگئی اسمین اسلامی طب کی

تاریخ کے ساتھ عزیز طالب علموں کو یہ نصیحت کیگئی کہ آپ طبیب بننے کی کوشش کریں، ڈاکٹر بننے کی نہیں" اور بتایا گیا کہ دیہات سے لیکر شہروں تک ہندوستان کی صحتِ عامہ کا دارمدار ولایتی طب پر نہیں، جو طب ہونے کے ساتھ بدیسی تجارت بھی ہے، بلکہ دیسی طب پر ہے جسکی اکثر دوائیں خود ہمارے ملک کی پیداوار ہیں،

مسلمان والدین اپنے بچون کو علوم عربیہ کی جو تعلیم دلاتے تھے، اس کے وجوہ مختلف تھے، مثلاً ان کا مذہبی ہونا اور ہماری تاریخ و ادبیات کا اُس کے اندر موجود ہونا، لیکن ان مذہبی اور علمی اسباب کے علاوہ اسکی ایک تیسری وجہ تھی کہ وہ معاش کا ذریعہ بھی تھی، علوم عربی پڑھنے کے بعد وہ حکومت وقت کے بڑے بڑے عہدے پاتے تھے، حکومت کے انقلاب نے ایک ایک کرکے ان تمام وجوہ معاش کے دروازے علوم عربی کے طالبعلمون پر بند کردیئے، اور اسی نسبت عربی تعلیم کی طرف توجہ بھی روز بروز کم ہوتی گئی، تاہم ابتک صرف دو دروازے کھلے تھے، ایک اسکولون کی مدرسی اور دوسری طبابت، سو فارسی کے دبیر و فاضل کے درجون نے پہلی چیز کا خاتمہ کردیا، اور اب اسکولون مین عربی کے مولوی فاضل کے بجائے فارسی کے منشی فاضل وہی استحقاق رکھتے ہین، بلکہ فارسی تدریس کے لیے انھین کو ترجیح دیجارہی ہے، دوسری چیز کا خاتمہ ان طبی اسکولون کے ذریعہ ہو رہا ہے جنمین طب کی ترقی کے لیے عربی کے بجائے اردو کتابون کے ذریعہ اردو خوانون اور فارسی خوانون اور نیم انگریزی دانون کو طب کی تعلیم دیجارہی ہے، ظاہر ہے کہ اب صرف مذہب اور علوم کی خاطر کتنے مسلمان اپنے بچون کی قربانی گوارا کرسکینگے؟ یہ ہین ہماری قوم پروہ تعلیمی عنایات، جنکا شکریہ ادا کرنا ہماری قوم پر ہر وقت واجب ہے،

۱۵-۱۶-۱۷ اپریل ۳۳ء کو لاہور مین ادارۂ معارف اسلامیہ کا جلسہ ہے، جسمین مختلف اہل علم اسلامی علوم و فنون پر مختلف مقالات پڑھینگے، اس سلسلہ مین دارالمصنفین کے بعض رفقا بھی لاہور جائینگے، اور جلسۂ مذکور مین اپنے مقالات پیش کرینگے، میرا مضمون "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا" ہوگا، مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی "سسلی کے اسلامی تمدن" پر اور مولوی سعید صاحب انصاری "عربی لغت کی تاریخ" پر مضامین پڑھینگے،

مقالات

استاذ العلماء جناب مولوی محمد لطف اللہ صاحب طاب ثراہ

از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی،

جب اس خاکدان سفلی مین اسلامی تمدن کی بہار آئی ہوئی تھی، اور اُس کے فیض سے ایشیا، افریقہ، اور یورپ تینون براعظم رشک گلزار بنے ہوئے تھے، اُس وقت قصبات کا ایک عظیم الشان نظام ممالک اسلامیہ مین قائم تھا، یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے جنسے شہر خصوصاً دارالسلطنت سیراب و شاداب رہتے، شہری آب و ہوا دو تین نسلون کے بعد دماغون کو سست اور پست کردیتی تو قصباتی اہل کمال تازہ زندگی لیکر پہنچتے اور بزم حیات کو از سر نو پر نور و معمور فرما دیتے، دہلی مرحوم مین شاہ صاحب کا اور لکھنؤ مین فرنگی محل کا خاندان لاکھون مین دو مثالین ہین،

ہمارا کول (علیگڈھ) بھی دور حیات مین اپنے قصبات پر نازان تھا، جلیسر (قدیم جالیسر) سے نصرت خان عہد علائی کا امیر نامور اٹھا، امیر خسرو پٹیالی سے جاکر دارالسلطنۃ بلکہ دنیا کا فخر بنے، جلالی کی فکر سے سفرنامۂ ابن بطوطہ معمور ہے،

وطن | انھی بستیون مین سے ایک بستی پلکھنہ ہے جو قصبۂ جلالی کے قریب آباد ہے، اسکی قدیم عظمت کی یادگار عہد بابری کی مسجد ہے، شیخ گھورن تاریخی ہستی ہین، اسی معدن سے وہ جوہر فرد نکلا جس کے انوار نے اس دور آخر مین علمی مجالس کو منور و تابان فرمادیا،

خاندان | کول اور اسکے ملحقہ قصبات و دیہات مین شیوخ کے خاندان آباد ہین جو حضرت شمس العارفین شاہ جمال کی

نسل مین ہین،

یہ بزرگ اپنے وقت کے اولیاے کرام مین تھے، ابن بطوطہ جب کول آیا تو آپ ہی کے پڑوس مین اُترا تھا،
مین حضرت کا ذکر کرتا ہے،

جو شجرہ اس خاندان مین محفوظ ہے وہ شاہد ہے کہ شیوخ جمالی حضرت امین الامۃ ابو عبیدہ ابن الجراح
رضی اللہ عنہ کی اولاد مین ہین اشکال یہان یہ ہے کہ امام ابن قتیبہ ؒ نے المعارف مین حضرت امین الامۃ کے ذکر مین
لکھا ہے، ولا عقب لہ، مفتی محمد لطف اللہ صاحب اسی خاندان سے تھے، والد مولوی اسد اللہ، فارسی خوان
کول مین وکالت کرتے تھے، اسی آمدنی سے بفراغت گزرتی تھی، تمغاے شرافت قصبے مین املاک بھی تھی جو بھائی
کے لیے چھوڑ رکھی تھی، اردو شعر کا ذوق تھا، ایک شعر یاد کر لو، ؎

لے اڑی طرزِ فغان بلبلِ نالان ہم سے
گل نے سیکھی روشِ چاک گریبان ہم سے

منشی نبی بخش سالک اکبرآبادی نے ایک جنتری کا ذکر کیا ہے جس سے بارہ برس کی تاریخین معلوم ہو جاتی
تھین، انھون نے چند اشعار لکھے جنسے جتنے سال کی تاریخین چاہو نکل آتی ہین، زعد مرحوم نے اپنی بڑی جنتری مین
چھاپے تھے، میرے پاس بھی محفوظ ہین،

آخر عمر مین ضیق النفس مین مبتلا ہو کر خانہ نشین ہو گئے تھے، والدہ سید غلام علی حسینی النسب ساکن جلیسر کی
دختر نیک اختر تھین، دو چچا تھے، بڑے منشی، ہبتہ اللہ، فارسی کے ماہر بڑے شاطر، املاک کا کام کرتے تھے، شطرنج
کی بہت سی چالون کے نقشے قلمبند کیے تھے جو ایک ضخیم مجلد مین خاندانی کتبخانے مین محفوظ ہین، فرائض کا ایک
رسالہ بھی خود ان کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا، چھوٹے حکیم اکرام اللہ طبیب تھے، ڈیرہ دون مین ایک انگریز کا معرکے کا
علاج کیا تھا، اس نے نوکر رکھ لیا، وہین وفات پا کر مدفون ہوئے، بھتیجے نے تجہیز تکفین کا اہتمام کیا، ان دونون
بھائیون کے نرینہ اولاد نہ تھی،

پیدائش

مفتی محمد لطف اللہ صاحب لکھتے ہین ۱۲۴۴ھ مین پیدا ہوئے، باپ نے تاریخ کہی، چراغم، باپ کے
۱۲۴۴ھ

کوئی بیٹے تھے، بلکہ تین گھرون کا چراغ، ناز نعمت لاڈ پیار مین پرورش ہوئی، جامع حالات صاحبزادے نے لکھا ہے کہ
اسی پرورش کا اثر تھا کہ مزاج مین ایک ضد تھی جو آخر عمر تک باقی رہی،

بچپن کے ایک رفیق کا بیان ہے کہ مولوی صاحب ان کھیلون مین تو ہمارے شریک ہو جاتے جو شرفا
کے لڑکے کھیلتے ہین، عامیانہ کھیلون مین شرکت نہ کرتے مثلاً گولیون کا کھیل ہم جب ایسے کھیل کھیلتے تو وہ الگ
بیٹھے دیکھتے رہتے،

نماز کے بچپن سے عادی تھے،

ابتدائی تعلیم

ملکھنے مین ایک میانجی موہن لال نامی تھے جو بچون کو ابتدائی کتابین کریما مقیمان وغیرہ پڑھایا کرتے
تھے، انھی سے پڑھنا شروع کیا، ایک روز ایک لڑکا خالق باری پڑھ رہا تھا، ع "راسو نولا ہے جان" معصوم
لطف اللہ نے ایک ہم مکتب سے کہا، نولا راسو ہے تو نولا (نیمہ دانہ) بر اسو ہو گا، دیکھو یہی انتقال ذہن زینت درس بنا
ابتدائی رسالے گھر پر پڑھکر جلیسر اپنی ننھیال مین گئے، وہان مولوی محمد عظیم اللہ سے فارسی پڑھی،
انتہائی کتابین اپنے پھوپھا مولوی حفیظ اللہ خان سے (جنکے خاندان مین خانی کا خطاب شاہی تھا) پڑھین،
یہ بڑے خطاط تھے، خاص وصف یہ تھا کہ چند روز مین شاگرد کا خط اپنے خط مین ملا دیتے تھے، مولوی صاحب
فرماتے تھے کہ میرے خط کی روش پھوپھا صاحب کے خط کی روش پر ہے، مولوی عبد الغنی خانصاحب شاگرد رشید نے
ڈالا یہ روش استاد سے حاصل کی، صاحبزادے بھی عموماً اسی روش پر لکھتے ہین جو نظر فریب، اور منشیانہ پختہ ہے
بعض فارسی کی کتابین مثلاً بہار دانش اپنے خسر سید رونق علی سے بھی پڑھین،

تحصیل علوم

فارسی سے فارغ ہو کر پندرہ برس کی عمر کے بعد اس آستانہ پر حاضر ہوئے جہان کی سند فضیلت ملنی مقدر تھی،
اوپر سن چکے ہو کہ مولوی صاحب کے والد مولوی اسد اللہ وکالت کرتے تھے، اسی سلسلے مین مفتی عنایت احمد
صاحب سے تعلقات تھے جو کول مین مفتی و منصف رہے، مفتی عنایت احمد صاحب شاگرد تھے، مولوی بزرگ علی صاحب کے

مولوی بزرگ علی صاحب

مشہور مردم خیز قصبۂ مارہرہ کے کنبوہ خاندان سے تھے وہین پیدا ہوے، والد کا نام حسن علی

خواجہ حسن ملتانی کی دسوین پشت مین، آغاز شباب تک باوجود باپ کی تاکید کے علم کی تحصیل کی جانب متوجہ ہوئے
عشق مجازی کے اثر سے فارسی غزل کا ذوق تھا، شوق تخلص کرتے تھے، زیادہ تاکید ہوئی تو گھر سے نکل گئے
بالآخر باپ نے اپنے پیر مرشد حضرت شاہ آل احمد صاحب عرف اچھے میان کی خدمت مین دعا کی التجا کی، دعا
فرمائی جو مستجاب تھی، تمام مشاغل چھوڑ کر تحصیل علم مین مصروف ہوگئے، اب شوق تھا تو کتاب کا، طلب تھی تو علم
کی، فرماتے تھے لوگ جوانی مین زندگی کے لطف حاصل کرتے ہین ہمنے تو شباب علم کی نذر کردیا، ابتداءً لکھنؤ اور
کلکتہ مین علم حاصل کیا، وہان کے اساتذہ کے نام معلوم نہ ہوسکے، بالآخر دلّی مین اس درسگاہ والا مین حاضر ہوئے
جو تمام ہندوستان کی ملجا و ماوی تھی، شاہ عبد العزیز صاحب سے علم حدیث حاصل کیا، ریاضی مولوی رفیع الدین
شاہ صاحب کے بھائی سے پڑھی جو اس فن مین امام وقت تھے،

تحصیل سے فارغ ہوکر خود درس کی خدمت شروع کی، آگرہ مین پڑھایا، کلکتہ کے دار العلوم کے مہتمم رہے، حکام
کے اصرار سے (جو اکثر شاگرد تھے) کول مین منصفی کا عہدہ قبول کرلیا، اسی زمانے مین وہان کی جامع مسجد مین اس
مدرسے کا احیاء کیا جس کو عہد محمد شاہی مین بانی مسجد نواب ثابت خان نے قائم کیا تھا، (اس کا ذکر اخبار الجمال مین ہے)
بالآخر منصفی سے استعفا دیدیا، جس کو شاگرد حکام نے تلمذ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوے بہت تامل کے بعد
منظور کیا، مستعفی ہوکر نواب وزیر الدولہ مرحوم کے اصرار پر ٹونک مین عہدۂ قاضی القضاۃ قبول کیا، آخر عہد تک
وہین رہے، ۱۲۶۲ھ مین انتقال کیا، ٹونک مین دفن ہین، تاریخ نگار نے ان کے یہ اوصاف لکھے ہین، تقوی،
تدبر، تواضع، تہذیب، تقریر دلنشین اور پر اثر، ایک بیٹے تھے مولوی محمد صدیق، فارغ التحصیل، علم ہندسہ اور
نجوم مین ماہر نیز علم تعبیر رویا مین، ٹونک مین عہدۂ قضا پر فائز رہے ۱۲۹۲ھ مین وہین رحلت کی،

مولوی بزرگ علی صاحب کی تصانیف مین سے دیوان فارسی قلمی میرے یہان ہے، کلام اوسط درجہ
کا ہے، صاف ہے اور پر اثر، نمونہ ملاحظہ ہو ؎

گر جلوۂ او عام کند پردہ دری را   در شیشہ چو مَی جوش دہد مغز پری را

زلف شکستِ دل و دین داد درستی   افراختہ قدت علم فتنہ گری را

نے صبر باند بر جا اکنون نہ تاب مارا   اے بے مروت آخر یک رہ بیاب مارا

کے صبح عید عیشِ صبحم فروغ یابد   چون نور بخشِ صبح ست آن آفتاب مارا

در دورِ چشم مستت مینہا خراب ست   تنہا نہ لعل میگون وارد خراب مارا

اُس زمانے کی شدید ضرورت کی بنیاد پر متعدد کتابین فارسی زبان مین ردّ نصاری مین لکھی ہین، انہین
مین سے کتاب ردّ نصاری کا ایک حصہ "بشارات" قلمی میرے یہان بھی ہے، اس کا عنوان ہے بشارات فارقلیط،
اس پر بعض عبارتین مفتی عنایت احمد صاحب کے قلم کی لکھی ہوئی ہین، ایک اور قلمی رسالہ میرے یہان ہے،
یہ ایک فارسی معما کی شرح ہے جو قاضی القضاۃ نجم الدین علی خان نے تفضل حسین کے نام لکھا تھا، اور جس مین بہت سی
علمی اصلاحین درج کی ہین، اس کا دیباچہ مفتی عنایت احمد صاحب نے استاد کی زندگی مین لکھا تھا، اس پر بھی مفتی
صاحب کے قلم کی عبارتین ہین، یہ رسالے مفتی صاحب کے کتابخانہ سے اور کتابون کیساتھ میرے پاس آئے تھے،

مفتی عنایت احمد صاحب اپنے وطن دیوہ ضلع بارہ بنکی مین پیدا ہوئے، ۹ شوال ۱۲۲۸ھ تاریخ ولادت ہے، تیرہ برس
کی عمر مین رامپور جاکر مولوی سید محمد صاحب بریلوی سے صرف نحو اور مولوی حیدر علی صاحب ٹونکی اور مولوی
نور الاسلام صاحب سے دوسری درسی کتابین پڑھین، وہان سے دلّی جاکر شاہ اسحق صاحب سے حدیث پڑھی، دلّی
سے علی گڈھ آئے، مولوی بزرگ علی صاحب سے جامع مسجد مین پڑھا، فن ریاضی کی تکمیل کی، بعد فراغ یہین مدرس
مقرر ہوئے، ایک سال مدرس رہکر مفتی و منصف کے عہدہ پر علی گڈھ ہی تقرر ہوگیا، اسی دور مین مولوی لطف اللہ
صاحب کے تلمذ کا سلسلہ شروع ہوا، مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری نے بھی اسی زمانے مین پڑھا، سید صاحب
صاحب درس فاضل ہوجانے کے بعد بھی تعجب سے فرمایا کرتے تھے کہ مفتی صاحب مجھکو ہدایہ اجلاس پر پڑھاتے
مین حاضر رہتا جب دوران مقدمہ مین فرصت ملتی اشارہ ہوتا مین پڑھنا شروع کردیتا، اسی اثنا مین پھر کام
مین مصروف ہوجاتے، باوجود اس کے ایسا پڑھایا کہ ساری عمر اسکی یاد رہی،

کول سے بریلی کا تبادلہ ہوا، بھیکن پور کے لئے ایک فخر یہ بھی ہے کہ مفتی صاحب نے اثنائے راہ مین یہان مع مستورات کے قیام فرمایا تھا،

بریلی کے قیام مین صدر امین ہوے، وہان کے تلامذہ مین قاضی عبد الجلیل صاحب قاضی شہر اور مولوی ندا حسین منصف شامل تھے، بڑا کارنامہ نواب عبد العزیز خان کا (باوجود ان کی آزاد منشی و صاحبزادگی کے) پڑھا دینا تھا، نواب صاحب نواب رحمت خان حافظ الملک شہید مرحوم کے پوتے تھے، گزشتہ پراونشل کانفرنس کے موقع پر حافظ الملک شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھی، مقبرہ کی محراب مین یہ جوہر دار شعر لکھا ہوا ہے، ؎

سرکشتہ بر نیزہ می زد نفس کہ معراجِ مردان ہمین است و بس

قصہ مختصر، صدر اعلائی کا پروانہ آگیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوگیا، اس کے فرو ہونے پر الزام بغاوت مین انڈمان بھیجدیے گئے، یہ ۱۲۷۴ھ کا واقعہ ہے، چار سال جزیرۂ مذکور مین رہے، جنگل مین منگل، اکابر علما کے قدمون کی برکت سے ان دنون یہ بدنام جزیرہ دار العلوم بن گیا تھا، علاوہ مفتی صاحب کے مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی، مفتی مظہر کریم صاحب وغیرہ علما بھی وہان تھے، اور سب کے سب باوجود مصیبت قید اور غریب الوطنی کے خدمتِ علم مین مصروف تھے، محقق خیرآبادی کے ذہن وقاد کے متعدد نتائج وہین وجود پذیر ہوے، مفتی مظہر کریم صاحب نے مراصد الاطلاع کا عربی سے اردو مین ترجمہ کیا، مفتی عنایت احمد صاحب نے کلام مجید حفظ کیا، تواریخ حبیب اللہ سیرۃ مین تالیف کی، تاریخی نام ہے، ۱۲۷۵ھ نکلتے ہین، منشی امیر اللہ تسلیم نے الفاظ تواریخ نبی سے تاریخ نکالی، یہ کتاب حکیم امیر خان کی فرمایش سے لکھی تھی، جو انڈمان مین سرکاری ڈاکٹر تھے اور جنکی غمخواری کا اعتراف دیباچہ مین فرمایا ہے، حجم سوا سو (۱۲۵) صفحے کا ہے، فی صفحہ سطر ۲۷- (نسخہ مطبع نظامی ۱۲۷۹ھ پیش نظر ہے) واقعات پوری تفصیل سے بقید تاریخ اور تشریح جزئیات کے ساتھ لکھے ہین، دیباچہ کی شہادت ہے کہ محض یاد سے لکھی گئی، قیاس کرو کہ اس عہد کے علما حضرت نبی کریم کے مبارک حالات کا کس قدر ذخیرہ سینے مین محفوظ رکھتے تھے، اور یہی سرمایۂ سعادت تھا، ہندوستان آکر سیرت اور حدیث کی کتابون سے مقابلہ کیا تو یاد کی صحت ثابت ہوئی،

ایک انگریز نے تقویم البلدان کے ترجمے کی فرمایش کی جو دو برس مین ختم ہوا، یہی ترجمہ رہائی کا سبب بنا، صرف کا رسالہ علم الصیغہ بھی وہین لکھا، ۱۲۷۷ھ مین رہائی پاکر کاکوری آئے، وہان شاگرد رشید مولوی لطف اللہ صاحب بھی حاضر ہوے، تاریخ پیش کی، ؎

چون بفضلِ خالقِ ارض و سما اوستادِ من شد ز قیدِ غم رہا

بہرِ تاریخِ خلاصِ آنجناب بر نوشتم آہ استادی بجا
۱۲۷۷ھ

مستقل قیام کانپور مین فرمایا۔ مدرسۂ فیض عام کی بنیاد ڈالی، خود درس دیا، پچیس یا تیس ماہوار تنخواہ لیتے تھے، مسلمان تجار کانپور مصارفِ مدرسہ کے کفیل تھے، ان مین حافظ برخوردار زیادہ نامور تھے، اسی مدرسہ کا فیض بالآخر ندوۃ العلما کی شکل مین عیان ہوا،

دو برس کے بعد حج کا ارادہ کیا، شاگرد جمع ہوئے، مولوی سید حسین شاہ صاحب واصف بخاری، مولوی لطف اللہ صاحب، نواب عبد العزیز خانصاحب، مولوی سید عزیز الدین صاحب تنکار پوری، استاد کے سامنے درس بھی دیا، مفتی صاحب شاگردون کی بہارین دیکھ دیکھکر باغ باغ ہوتے تھے، بالآخر مولوی سید حسین شاہ صاحب کو مدرس اول اور مولوی لطف اللہ صاحب کو مدرس ثانی مقرر فرماکر حج کو روانہ ہوگئے، اس زمانے مین جہاز ہوائی تھے، جدہ کے قریب پہنچکر جہاز پہاڑ سے ٹکراکر ڈوب گیا، مفتی صاحب بحالتِ نماز احرام باندھے ہوئے غریق و شہید ہوئے، یہ واقعہ، ۷ شوال ۱۲۷۹ھ کا ہے، ۵۲ برس کی عمر ہوئی،

تصانیف | شرح ہدایۃ الحکمہ صدر شیرازی، تصدیقات حمد اللہ اور شرح چغمینی پر حواشی، اردو مین بہت سے مفید عام رسالے ہین جنکے نام عموماً بے تکلف تاریخی ہین، عام مولویون کی روش کے خلاف ان رسالون کی زبان صاف اور بامحاورہ ہے، مضامین علمی اور اخلاقی ہین، اس زمانے کی مقبولِ عام روش مناظرہ سے بچکر پیرایہ بیان ایسا اختیار کیا ہے جو دلنشین ہے، دلپذیر ہے، ہنگامہ آرائی سے پاک ہے، خلاصہ یہ کہ مصری کی ڈلیان مٹرون کے چھلکے مین نہین رکھی ہین، ایک مختصر سا فنڈ جمع کر لیا تھا اسکی مدد سے یہ رسالے طبع ہوتے، تقسیم کئے جاتے، مدرسہ فیض عام کا قیام

اور نشر علم کا یہ طریقہ مفتی صاحب کی دور اندیشی اور ضرورت کے صحیح اندازہ پر دال ہین،

ایک کتاب ہیئت جدید (فیثاغورسی) پر لکھی تھی، مسمی بہ مواقع النجوم، اسکو ہیئت کے ماہر بعض انگریزون نے پسند کیا، ایک کتاب عربی مین بے نقط لوامع العلوم واسرار المعلوم کے نام سے لکھی تھی، اس مین چالیس علوم کا خلاصہ لکھنا پیش نظر تھا، ہر علم کا نام بے نقط تھا، مثلاً تفسیر علم کلام اللہ۔ حدیث علم کلام الرسول، فقہ علم الاحکام علی ہذا القیاس تمام نہ ہوئی تھی کہ عمر تمام ہوگئی، مسودہ ساتھ غرق ہوگیا، مفتی صاحب تمام علوم کا درس پوری توجہ سے دیتے تھے، ریاضی مین ممتاز تھے، ادب کا ذوق تھا، کانپور کے قیام مین روزانہ شام کو میدان مین ہواخوری کے لئے تشریف لیجاتے، مولوی سید حسین شاہ صاحب سے ادبی وعلمی ذکر ہوتے جاتے، ایک روز کی صحبت یہ تھی کہ مفتی صاحب اردو اساتذہ کے چیدہ چیدہ اشعار پڑھتے، سید صاحب اس کا ہم مضمون فارسی شعر پڑھ دیتے،

بازخوانم قصۂ استادِ خود　　　تا در و دیوار را آرم بوجد

ابتداءً مفتی صاحب نے شاگرد جدید کو اپنے ایک شاگرد کے سپرد کیا جس نے صرف نحو پڑھائی، ہدایۃ النحو شروع ہوئی تو خود پڑھانا شروع کیا، استاد کی شفقت اور شاگرد کی محنت نے یہ نتیجہ دکھایا کہ ڈیڑھ سال مین ملاحسن تک پہنچ گئے، ملاحسن کلیات خمسہ تک پڑھا کر فرمایا کہ اب سبقاً سبقاً اس کے پڑھنے کی ضرورت نہین خود مطالعہ سے پورا کر لو، جہان ضرورت ہو دریافت کر لو، فرماتے تھے کچھ دن دیکھا دریافت کی ضرورت نہ ہوئی پھر چھوڑ دیا، نور الانوار شروع ہوئی، دس پندرہ سبق پڑھا کر ارشاد ہوا اب مطالعہ کر کے ہمسبقون کو پڑھا دیا کرو، چنانچہ مطالعہ اور بوقت ضرورت استفادہ کر کے ساری کتاب پڑھا دی، استاد نے خوش ہو کر اس کی جگہ قاضی مبارک شروع کرائی، اول سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی، جس نسخہ مین پڑھا اس پر منہیات اپنے قلم سے لکھے، یہ نسخہ کتابخانے مین محفوظ تھا، قاضی مبارک کے بعد حمد اللہ کی نوبت آئی،

صبح کی نماز کے بعد مفتی صاحب تلاوت فرماتے تھے، حکم تھا کہ اس وقت حاضر رہین، دوران تلاوت مین مشکل صیغہ آتا تو اُن کی طرف دیکھتے یہ حل کرتے، حل نہ کر سکتے، تو بعد تلاوت خود حل کر کے بتاتے،

تبادلے کے وقت تک کتابین ختم نہ ہوئی تھین، لہذا استاد کے ساتھ بریلی گئے، وہان جملہ کتب درسیہ کی تحصیل سے فارغ ہوئے بعد فراغ مفتی صاحب نے اپنے ہی اجلاس کا سر رشتہ دار مقرر کر لیا، اس خدمت پر فائز تھے کہ استاد اندمان بھیجدیئے گئے، شاگرد بادلِ خستہ گھر چلے آئے، اس طرح چودہ برس مسلسل استاد کی خدمت سے فیضیاب رہے،

بریلی مین قیام کس وقار علمی سے رہا تھا اس کو ذیل کے واقعہ سے سمجھو لوگے ۱۳۱۶ھ مین ندوۃ العلماء کا اجلاس بریلی مین ہونے والا تھا، مخالفین اور موافقین شکست و فتح کی سر توڑ کوششین کر رہے تھے، مولوی صاحب صدارت کے لیے حیدر آباد سے تشریف لانے والے تھے، اعلانون مین زبانی بیانون مین جس قدر ندوہ کے متعلق اعتراض ہوتے اسی قدر مولوی صاحب کی ذات ہدف اعتراض ہوتی، بالآخر صدر نشین فائز بریلی ہوئے پرانے شہر کے شرفا جب اعتراض سنتے سنتے تنگ آگئے تو اس تردد مین پڑے کہ آخر یہ مولوی لطف اللہ ہین کون ایک تو وہ تھے جو یہان تھے اگر وہی ہین تو حیرت ہے کہ اُن کے عقائد و حالات ایسے بدل گئے،

بالآخر ملنے اور زبانی گفتگو کا فیصلہ کیا، وہ سمان میری آنکھون مین آج بھی ایسا ہے گویا کل کی بات ہے کہ مغرب و عشا کے مابین پرانے شہر کے معمر شرفار کی ایک جماعت قیام گاہ مین آئی، ایک دوسرے کو دیکھ کر دیرینہ اخلاص و محبت کے اثر سے گرمجوشانہ ملے رسمی گفتگو کے بعد اصل مدعا پر گفتگو ہوئی، زبان حق بیان سے ندوۃ العلماء کے مقاصد و احوال سنکر جو اثر سامعین پر ہوا دیدنی تھا نہ شنیدنی، متحیر آئے تھے مطمئن اٹھے، جاتے ہوئے جو الفاظ زبان پر تھے خدا کرے ان کا اعادہ کبھی نہ ہو،

حاصل کلام۔ بریلی سے کول آنے کے بعد عسرت اور بیکاری کا زمانہ تھا، آخر کا ٹھون سے ملکر ایک مکتب جاری کر لیا، ان کے لڑکون کو چھوٹے چھوٹے رسالے پڑھایا کرتے تھے، دس روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، صاحب عیال تھے دو بچے ہو چکے تھے، سارا کنبہ اسی قلیل تنخواہ مین بسر کرتا، کبھی کبھی فاقے کی نوبت پہنچ جاتی بعض

خاندانی واقعات کی وجہ سے جائداد کی آمدنی سے مستفید ہونے کا موقع نہ تھا، دو سال کا زمانہ اسی حوصلہ مندی سے بسر کردیا، اس عرصے مین والد سخت علیل ہوگئے، تیمارداری اس غمخواری سے کی کہ دوا لینے پیادہ پا ٹلکھنہ سے کول جاتے اور ہر روزہ واپس آتے، ان دونون مقامون کے درمیان فاصلہ چودہ میل کا ہے،

بالآخر جیسا کہ تم اوپر سن چکے مفتی عنایت احمد صاحب انڈمان سے واپس آکر حج کو گئے، اور مولوی صاحب کا تقرر مدرسہ فیض عام کی مدرسی پر ہوگیا، زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا کہ مولوی سید حسین شاہ صاحب نواب شاہجہان بیگم کی طلب پر بھوپال چلے گئے، مولوی صاحب مدرس اول ہوگئے،

یک لطیفہ مولوی سید حسین شاہ صاحب کے قیام بھوپال کا بے موقع نہ ہوگا سید صاحب کی مراسلت بعض مسائل مین مولوی سید صدیق حسن خان صاحب سے ہوئی (اس وقت تک نواب نہ ہوئے تھے) اس مین سید صاحب نے ایک شعر لکھا ؎

برخیزم بت شکن کہ بتے چند بشکنم — در سومنات شور و شر دیگر افگنیم

بعض حریفون نے نواب شاہجہان بیگم صاحبہ کو یہ کہکر بدظن کرنا چاہا کہ سید صاحب نے دارالاسلام بھوپال کو سومنات کہا، سید صاحب نے سنا تو جواب دیا اور لاجواب دیا، "سومنات ہمان است کہ دران سلطان محمود غزنوی شور و شر افگندہ بود . . . . . . بھوپال کہ سلطنتِ مومنات ست دران چہ جائے سومنات ست"

خلاصۂ کلام، مولوی صاحب نے سات برس تک مدرسۂ فیض عام مین درس دیا، کس قوت سے یہ بھی سن لو، میرے استاد مولوی عبدالغنی خان صاحب مدرسۂ موصوف کے اولین شاگردون مین تھے، مجھ سے بیان فرمایا کہ مدرسہ کے قریب ایک مسجد تھی، استاد اور شاگرد صبح کو ایسے وقت وہان پہنچ جاتے کہ جماعت فجر سے پہلے تفسیر بیضاوی کا سبق ہو جاتا تھا، اس سے فارغ ہو کر باجماعت نماز پڑھتے، نماز سے فارغ ہوتے ہی درس شروع ہو جاتا، دوپہر تک رہتا، اس کے بعد وقفہ اس قدر کہ کھانے اور کچھ آرام کے بعد ظہر باجماعت ادا ہوتی، نماز کے بعد درس، عصر کے بعد پھر درس، مغرب کے وقت ختم، کبھی ایک آدھ سبق بعد مغرب بھی ہو جاتا،

درس مین اتنا انہماک تھا کہ وطن کا آنا جانا شدید ضرورت ہی سے ہوتا وہ بھی جریدہ تاکہ زیادہ قیام نہ کرنا پڑے،

کانپور مین سات برس رہنے کے بعد مرکز اصلی کی جانب رجوع فرمایا، علی گڑھ کے مدرسۂ جامع مسجد مین اول مدرسی پر تقرر ہوا، پچاس ماہوار تنخواہ ٹھہری، صورت یہ ہوئی کہ مولوی صاحب کے شاگرد خواجہ محمد یوسف مرحوم وکیل نے مدرسۂ مذکور کو از سر نو جاری کیا، استاد کو کانپور سے بلا کر مدرس اول مقرر کیا، خواجہ صاحب تعلیم قدیم وجدید دونون کے دلدادہ تھے، ٹرسٹی بل کے خرخشہ مین آنے تک سر سید مرحوم کے ساتھ اور محمڈن کالج کے سرگرم معاونین مین تھے مدرسہ کے مصارف کا بڑا جز چھتاری اور بھیکن پور کی ریاستون سے ادا ہوتا تھا، کیسی نیک کمائیان تھین جو ہند سے بخارا تک فیض پہنچانے کا ذریعہ بنین، مدرسہ کی رونق اور طلبا کا ہجوم قابل دید تھا، مولوی صاحب دوپہر کا کھانا مسجد ہی مین تناول فرماتے، صبح سے آکر عشا کے وقت دولتخانے جاتے،

آج پیریڈ (PERIOD) گننے والے ان باتون کو کیا سمجھین گے نہ سمجھین تو واقعہ تو واقعہ ہی رہے گا،

ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے بڑے بڑے علما اسی زمانے مین فیضیاب ہوئے، پہلی فارغ ہونے والی جماعت مین (جو کانپور سے ساتھ آئی تھی) مولوی سید محمد علی صاحب، مولوی عبدالغنی خان صاحب، مولوی احمد حسن صاحب، مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی، مولوی عبدالحق صاحب دہلوی صاحب تفسیر حقانی اور مولوی سید محمد اسحٰق صاحب بیاوی شامل تھے، دیکھو! انمین ہر ایک کس شان علمی مین جلوہ فرما ہوئے ثانی الذکر بعد فراغ استاد کی جگہ کانپور مین مدرسہ فیض عام کے مدرس اول مقرر ہوئے، ایک خط میرے پاس محفوظ ہے جس مین مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم فرنگی محل نے آخر الذکر موصوف کی قوت تدریس کی مدح وثنا لکھی ہے

ذرا یہ بھی سن لو کہ یہ علما کس طرح پیدا ہوئے، میرے استاد نے مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک بار میرزا دبیر مرحوم لکھنؤ سے کانپور آئے، ان کی آمد نے کانپور مین ایک غلغلہ ڈالدیا، مولوی صاحب نے شاگردون کو اجازت دی بلکہ شوق دلایا کہ مرزا صاحب کو دیکھین، ان کا پڑھنا سنین، پھر یہ موقع کہان ملیگا، فرماتے تھے مجھکو سبقون نے مہلت ہی نہ دی کہ جاتا، نہ دیکھنے کا اب تک افسوس ہے، یہ بھی فرماتے تھے کہ علیگڈھ مین طلبا کے رہنے کی جگہ جامع مسجد کے حجرے تھے، ۲ دو مجوب حجرے اور بھی تھے، جامع مسجد کے عالیشان مینارون

مین زینہ کی گھوم سے درمیان مین جو وسعت پیدا ہوگئی ہے وہ بھی حجرے کا کام دیتی، شائق طلبا ان کی فکر مین رہتے، خالی ہونے سے پہلے درخواستین گذر جاتین، فرماتے تھے کہ ایک بار ان مین سے ایک حجرہ مجھکو بھی مل گیا تھا، نیچے کا دروازہ بند کرکے مطالعہ کو بیٹھ جاتا تو دنیا وما فیہا کی خبر نہ رہتی، مطالعہ کا جو لطف وہان آیا کہین نہ ملا، یہ بھی فرماتے تھے کہ درس سے فارغ ہوکر پہلی فکر یہی ہوتی کہ استاد کی تقریر دل مین ایسی نقش ہو کہ کبھی نہ بھولے، راستہ اسکی ذہنی تکرار مین صرف ہوتا، مکان پر پہنچکر فوراً قلمبند کیجاتی، اس عرصے مین دوسرے ہم سبق آجاتے اُن سے تکرار کیجاتی، ہرایک اپنی اپنی یاد سے اعادہ کرتا، اتنی کاوش کے بعد جب تقریر ذہن نشین ہولیتی تو چین سے بیٹھتے ضروریات کی جانب توجہ کرتے،

یہ بافیض درس ۱۲۸۵ھ سے بغایۃ ۱۳۱۲ھ، ۲۷ برس مسلسل حیدرآباد کے تعلق تک جاری رہا، استادون نے پڑھا، باپون نے پڑھا، شاگردون کے شاگرد اور بیٹے بھی فیضیاب ہوئے، عجب اتفاق ہے سب سے پہلے دور مین میرے مکرم استاد مولوی عبد الغنی خان صاحب نے پڑھا تھا، سب سے آخر کے باقاعدہ دور مین ننگ تلامذہ راقم شروانی شامل تھا، اس درس مین میرے ہم سبق مولوی امانت اللہ صاحب مرحوم، مولوی سید عبد اللطیف صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ، مولوی محمد ہاشم مرحوم سنبھلی مولوی صدیق حسین حال مدرس مدرسہ جامع مسجد، مولوی اظہر حسین مرحوم بہاری تھے، سوائے عاجز کے سب کے سب عالم اور علم کے خادم بنے،

جامع مسجد کے دورِ درس مین یہ چشمہ اس سہ دری سے جوش زن تھا جو جنوبی منارے کے متصل ہے، مولوی عبد القدوس صاحب پنجابی مسجد کے اندر درس دیتے، حافظ رحیم بخش مرحوم قرآن شریف حفظ کراتے، ایک دوسرے مولوی عبد القدوس فارسی پڑھاتے، طلبا کی کثرت تھی، جامع مسجد مین نماز کی جماعتین بڑی شان سے ہوتی تھین، شہر کے دوسری مسجدین بھی طلبا سے آباد تھین،

یہ یادگار زمانہ درس اس شان سے جاری تھا کہ اس کو صدمہ پہنچا، اس عہد مین تقلید و عدم تقلید کے جو ہنگامے ملک مین برپا تھے ایک بار بیچارہ کول بھی ان کی زد مین آگیا، معرکے گرم ہوئے، مخالفت کے طوفان اٹھے،

مولوی صاحب نے جامع مسجد مین درس موقوف فرمادیا، مکان کے قریب ایک چھوٹا کمرہ کرایہ پر لیکر اس مین پڑھاتے تھے، مین وہین حاضر ہوا، ایک شکستہ بوریئے پر نشست ہوتی، دل مین اب تک اس عزت کی یاد ہے، کاش پھر نصیب ہوتی، طوفان بے تمیزی کا انجام یہ ہوا کہ مولوی صاحب کو زہر دیا گیا،

زہر خورانی

۲۲ محرم الحرام ۱۳۱۲ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۸۹۴ء کو ایک خط مولوی صاحب کی خدمت مین آیا، لکھا تھا کہ مین آپ کا شاگرد ہون، تلاشِ معاش مین سرگردان تھا، مان نے منت مانی تھی کہ نوکری لگنے پر پہلی تنخواہ سے مولود شریف کی مجلس کرینگی، چنانچہ ملازمت ملجانے پر مجلس کیگئی، شیرینی آپکی خدمت مین بھی بھیجتا ہون، دوسرے روز ایک شاگرد اسٹیشن جاکر پارسل لے آئے، اندر بھیجدیا، کھولا تو نکتی کے بڑے بڑے لڈو نکلے، ان مین سپید مصری کے دانے بکثرت چمک رہے تھے، تبرک کے خیال سے پارسل کے کھلتے ہی آدھا لڈو مولوی صاحب نے کھالیا، اتفاقاً کوئی اور عزیز اس وقت پاس نہ تھا، ورنہ حسب عادت اول اسکو کھلاتے،

تھوڑی دیر مین قلب پر گھبراہٹ محسوس ہوئی، استفراغ ہوا، بی بی صاحبہ کو بلاکر ماجرا کہا، انھون نے فوراً منجھلے صاحبزادہ مولوی عنایت اللہ صاحب کو طلب کیا، جو درس چھوڑ کر فوراً حاضر ہوئے، یہ طبیب بھی تھے، دیکھا کہ استفراغ جاری تھا، گھبراکر سبب پوچھا تو پارسل کے آنے اور لڈو کھانے کا واقعہ معلوم ہوا، لڈو دیکھے تو معلوم ہوا کہ مصری نہ تھی، سنکھیا سے بھرے ہوئے تھے، بہرحال یونانی اور ڈاکٹری ممکنہ تدابیر کی گئین، طبیب اور ڈاکٹر برابر حاضر رہے، شہر مین ایک تلاطم تھا، شب کو حالت زیادہ نازک ہوگئی جس سے معالج بھی گھبرا گئے، قصہ مختصر فضل الٰہی شامل حال تھا کہ اس سخت مہلکے سے نجات ملی، ۲۰ ستمبر کو غسل صحت ہوا، اہل شہر نے اظہارِ مسرت و شکر اس طرح کیا کہ چندہ کرکے جامع مسجد مین شب کو مجلس میلاد مبارک منعقد کی، روشنی کی گئی، صبح کو شیرینی تقسیم ہوئی،

پولس نے مجرم کی تلاش کی، پتہ نہ چلا، مولوی صاحب نے کسی پر شبہہ ظاہر نہین فرمایا، اس پر ہمیشہ شکر فرماتے تھے کہ پارسل کھلنے کے وقت کوئی عزیز پاس نہ تھا، ورنہ وہ بھی شیرینی سے

مسموم ہو جاتا، مہربانِ نامہربان نے تو اپنے زعم باطل مین سارے گھر کے خاتمے کا سامان کر دیا تھا مگر ع

"دشمن اگر قوی ست، مہربان قوی تراست"

اس حادثے نے علمی مصیبت کی شکل یہ اختیار کی کہ مولوی صاحب کا دل علیگڑھ سے بیزار ہو گیا، درس کی جانب رغبت نہ رہی، طلبا کی خاطر سے بادلِ ناخواستہ پڑھاتے تھے اس پر بھی ناغہ بہت ہوتا،

دستِ قدرت نے جلد علیگڑھ کے ساکنین کو یہ دکھا دیا کہ اب وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ علم و فضل کا ایسا سرمایہ دار اُن مین رہتا،

تعلق حیدرآباد غفران منزل آصفجاہ سادس کی فرمانروائی اور سر وقار الامرا مرحوم کی مدار المہامی کا دور تھا، مدار المہام کو مسلمانون کی مذہبی تباہ حالی کا احساس ہوا، یہ ارادہ کیا کہ کوئی بلند پایہ عالم شمالی ہند سے طلب کر کے خدمت اصلاح سپرد کرین، اتفاق وقت مولوی صاحب کے ایک بنگالی طالب علم اس زمانے مین مزاج مین درخور تھے، قدرۃً انھون نے اپنے استاد کے تقرر کی تجویز پیش کی، مدار المہام نے منظور کی چنانچہ دسمبر ۱۸۹۴ء مین (یعنی زہر خورانی کے واقعے کے تین مہینے بعد ہی) حیدرآباد سے مراسلہ آیا کہ یہ تقرر منظور ہو تو سفر خرچ بھیجا جائے، یہان سے منظوری گئی، وہان سے زادِ راہ آگیا،

مشاہرہ سات سو روپیہ ماہوار، خدمت صدارت المدرسین،

۲۰ر فروری ۱۸۹۵ء کو بعد نماز جمعہ اہل شہر سے رخصت ہو کر حیدرآباد روانہ ہوئے، منجھلے فرزند مولوی عنایت اللہ صاحب کو اپنی جگہ جامع مسجد مین صدر مدرس مقرر کیا،

تین نامور شاگرد مولوی سید محمد علی صاحب، مولوی عبد الغنی خان صاحب اور مولوی عبد الجلیل صاحب افغانی اور چھوٹے صاحبزادہ میان عبد الحمید ہمراہ تھے، حیدرآباد پہنچنے پر شایستہ استقبال ہوا، مہمان خانۂ ریاست مین قیام،

قضائے الٰہی اسی عرصے مین مفتی عدالت مفتی محمد سعید صاحب مرحوم نے (جو مدراس کے علمی خاندان کے

سرمایۂ سعادت تھی) انتقال فرمایا، قدرت نے مولوی صاحب کو بجائے خدمت صدر المدرسین کے اس عہدے کیلئے نامزد کیا تھا، چنانچہ ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پر ۱۲ مارچ ۱۸۹۵ء کو عہدۂ مذکور پر تقرر ہو گیا،

ممالک محروسۂ سرکار عالی مین اب تک مطابق شرع قصاص کا طریقہ جاری ہے، پھانسی نہین ہے قصاص کے لیے حضور نظام کی منظوری بحیثیت فرمانروائے اسلام ضروری ہے، حضور اس وقت منظور فرماتے ہین کہ مفتیِ شرع فتویٰ دین، اس خدمت کے لیے عہدۂ افتا مجلس عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) مین قائم ہے، ضرورت کے وقت مفتی اجلاس مین بیٹھکر ججون کے ساتھ بھی کام کرتے تھے،

نواب وقار الامرا بڑے سیر چشم عالی حوصلہ امیر تھے، عمارت کا ایسا سلیقہ تھا کہ انجینیرون کو بھی کم حاصل ہوا ہوگا، قصر فلک نما ان کے ذوقِ تعمیر کی نادر شہادت ہے،

مفتی صاحب کی (اب ہم مولوی صاحب کو مفتی صاحب کے لقب سے یاد کرتے ہین) تعظیم و بزرگداشت ہمیشہ ملحوظ رکھتے، اطلاع ہونے پر فوراً یاد فرماتے، تعظیم کو کھڑے ہو جاتے، بعض اوقات کرسی اپنے ہاتھ سے بچھاتے،

چند سال یہ خدمت انجام دی تھی کہ قویٰ کے ضعیف ہونے پر اثر سمیت نے پھر قوت دکھائی، ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء مین دفعۃً درد سر شدید لاحق ہوا، صاحبزادہ مولوی امانت اللہ صاحب نے اپنے منجھلے بھائی مولوی عنایت اللہ صاحب کو بلایا، (جو طبیب بھی تھے) انھون نے سبب مرض سمیت تجویز کر کے معالجہ کیا، چنانچہ روغن کاہو اور روغن بادام سرکہ مین ممزوج کر کے بدفعات ڈھائی سیر سر پر ملا گیا، تب افاقہ ہوا، خارجی تدابیر اس وقت تو مؤثر ہو گئی، مگر پھر دوسرا فساد نمایان ہوا، تمام جسم پر آبلے نمودار ہو کر پھوٹے اور سارا جسم زخم بن گیا،

"دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

بالآخر رخصت علالت لیکر دلی تشریف لائے، معالجہ کارگر نہ ہوا، مزید رخصت حاصل کی گئی، افاقہ ہوا تو دکن کو مراجعت کی، زحمتِ امراض باقی تھی، درد سر شدید مزید بران، بے تکلف علی حزین کا شعر صادق تھا؎

چہ شد یا رب کہ امشب دردِ سر تسکین نمی یابد زبے تابی سرم میگردد و بالین نمی یابد

مولوی عنایت اللہ صاحب بھوپال سے پھر طلب ہوئے، ان کی تدبیر سے درد سر رفع ہوگیا، پانی اتر آیا
کا علاج لوکا بابو ایک مدراسی وید نے بڑے معرکے سے کیا، دو مہینے سے زیادہ معالجہ جاری رہا، پوری صحت
ہوگئی، اب تیسرا مرض ضعف پیری نمودار ہوا، آنکھوں کی بینائی سرعت سے کم ہونے لگی، اس عالم مین ایک
خط مولوی عنایت اللہ صاحب کو لکھا ہے اس مین تحریر فرماتے ہین:-

"ان آنکھون سے اگر بیت اللہ اور روضۂ اقدس کو نہ دیکھا تو واے بر من و واے بر ناکامیِ من،

خیر، رضینا بما قضا اللہ علینا"

مراجعت وطن | چھ سات مہینے مین روشنی بالکل جاتی رہی، روشنی کے ساتھ تعلق ریاست بھی گیا، علیگڑھ تشریف
لائے، ڈاکٹرون نے پانی پختہ ہونے کے لیے ڈھائی سال کی مدت معین کی، چنانچہ یہ زمانہ صبر و رضا سے بسر فرمایا،
۱۳ مارچ ۱۹۱۰ء کو لکھنؤ کے مشہور معالج چشم ڈاکٹر اینڈرسن نے بڑی توجہ اور بزرگ داشت کا اپنا
قدح کیا، ڈاکٹر کی رائے تھی کہ ایک آنکھ کا آپریشن ہو دوسری دوسرے وقت کے لیے محفوظ رہے، ادھر سے
اصرار ہوا کہ دونون آنکھ کا آپریشن کر دیا جائے، حسرت اس پر ہے کہ اپریشن کے بعد ضروری احتیاط نہ کی گئی، حرکت
کرنا، آواز سے بات کرنا، پانی سے چہرہ کو دھونا وغیرہ ذلک امور ممنوع تھے، باوجود معالج کی تاکید و توجہ کے
کسی کی پابندی نہ ہوسکی، نتیجہ یہ کہ دونون آنکھین خراب ہوگئین، ایک کا ڈھیلا بہہ گیا، دوسری خراب ہوکر رہ گئی،
آنکھون کے جانے کا جو صدمہ ہوا ہوگا ظاہر ہے، معذوری نے چلنا پھرنا چھڑا دیا، اس کا اثر عام صحت پر
خراب پڑا، مالی دقتین بھی پریشان کرتی رہین، مجھکو اس زمانے مین حاضری کا مسلسل موقع حاصل ہوتا رہا، باوجود
معذوری و پریشانی کے رکھ رکھاؤ کا اہتمام پورا تھا، ہمیشہ صابر و راضی برضا دیکھا، لباس وغیرہ صاف مرتب،
سننے کے لائق یہ بات ہے کہ مرض، عدم بصارت، مالی دقت ان مین سے ہر مصیبت سوہان روح
تھی، ہمت و استقلال دیکھو، درس اس حالت مین بھی جاری تھا، مولوی بدر الدین اور مولوی کرم الٰہی اسی
زمانے کے تلامذہ مین ہین، زیادہ توجہ درس حدیث و تفسیر پر تھی، غایت شوق، فرماتے تھے "میان مولوی

بدر الدین جب پڑھنے آجاتے ہین تو مین اپنی تکلیفین بھول جاتا ہون، اور جب تک ان کو پڑھاتا رہتا ہون ہائے ہائے
سے نجات مل جاتی ہے"،

اسی زمانے کا ایک واقعہ مولوی سید سلیمان اشرف صاحب نے بیان فرمایا، اپنے علیگڈھ آنے کے تیسرے ہی دن
سلام کو حاضر ہوے، ایک روز پہلے جامع مسجد مین بیان ہوچکا تھا، حاضری پر مخصوص خاندانی طریقے سے قدم لیے مولوی
صاحب اس وقت آرام کرسی پر آرام فرما تھے، بغیر تعارف صاف الفاظ مین فرمایا "مولوی سلیمان اشرف" اور پھر یہ شعر پڑھا

گر تو تعظیم خواہی از من زار بہر تعظیم خود مرا بردار،

دوسرا واقعہ صاحبزادہ مولوی امانت اللہ صاحب کی زبانی، شرح چغمینی کے پڑھانے مین ایک دائرہ کے
متعلق اشکال پیش آیا، حاضر خدمت ہوکر مشکل پیش کی، فرمایا، امانت اللہ! اب دماغ کہان رہا، خیر ایک لوٹا مٹی
کا لو، لوٹا لایا گیا، ایک ہاتھ پر الٹا کر کے کرہ بنا لیا، دوسرے ہاتھ کی انگلی کو گردی حرکت دی، صاحبزادہ کا بیان
ہے کہ انگلی کا حرکت کرنا اور مسئلے کا سمجھ مین آجانا گویا ایک ہی بات تھی،

تیسرے واقعے کا مولوی معین الدین صاحب اجمیری نے ذکر کیا، میر زاہد کی ایک تقریر باوجود مکرر غور کے
سمجھ مین نہین آتی تھی، حاضری کے وقت اشکال پیش کیا، سنتے ہی فرمایا کہ اس مسئلے کے متعلق اوپر کے مقدمات کی
تقریر مین فلان غلطی ہوئی ہے، اسکی تقریر اس طرح کر دو حل ہوجائیگا، چنانچہ تقریر زاہدی کا مضمون صاف ہوگیا،

وفات | ۱۳۳۴ھ مین عرفے کے دن مطابق ۸ اکتوبر ۱۹۱۶ء تین اور چار بجے سہ پہر کے درمیان بمقام کول
(علیگڈھ) انتقال فرمایا، یہ وہ دن تھا کہ میدان عرفات اہل ایمان کی لبیک سے گونج رہا تھا، نوے برس کی
عمر ہوئی، حضرت شاہ جمال العارفین کے جوار مین آسودہ ہین، چند قدم کے فاصلہ پر شاگرد رشید مولوی عبد الغنی خان
صاحب مدفون ہین،

حلیہ | بلند بالا، بدن دوہرا، رنگ سرخ سپید، سینہ چوڑا، پیشانی وسیع، آنکھین بڑی روشن، ناک دراز بھاری
ہونٹ باریک، دہانہ چھوٹا، گردن لانبی، داڑھی سپید نورانی، ہنس مکھ چہرہ، زہر کے اثر سے پہلے قوی اعلیٰ درجہ

کے تھے، صحت بہت اچھی تھی، سردی گرمی اور محنت کے اثر سے بالاتر،

لباس انگرکھا، کرتا، عرض کا پائجامہ، سر پر اکثر دو پلی ٹوپی، خاص اوقات مین منشیانہ طرز کا عمامہ سر پر اس پر سپید چادر مردانہ مین ہمیشہ پورے لباس مین نمودار ہوتے، صرف کرتے مین کبھی برآمد نہ ہوتے، گرتہ جسم سے گرمی مین یا تخلیہ مین بھی جدا نہ ہوتا، لباس کی درستی اور صفائی کا پورا اہتمام رہتا، مین نے مرض اور نابینائی کی حالت مین بھی لباس میلا یا فرسودہ نہین دیکھا،

عادات نشست برخاست اور گفتگو مین تہذیب و وقار کی پوری شان تھی، نگاہ نیچی رہتی، کم سخن تھے، خاموشی مین بھی ایک عالم شگفتگی محسوس ہوتا، روش سادہ تھی، جفاکشی اور محنت داخلِ عادات تھی، چھتری کبھی نہ لگاتے، شدتِ گرما مین سر پر چادر رکھکر دھوپ مین چلے جاتے، اس سلسلے مین ایک جان پرور واقعہ سن لو،

گرمی کے سخت موسم مین ایک بار مدرسۂ عالیہ کا امتحان لینے رامپور تشریف لے گئے، امتحان سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے بارہ بجگئے، حسب عادت سر پر چادر رکھکر پیادہ پا استاذ العلما مولوی محمد ہدایت اللہ خانصاحب صدر مدرس مدرسۂ جونپور کے مکان پر جا پہنچے، مولوی صاحب قیلولے کے لیے زنانہ مکان مین جا چکے تھے، اطلاع پر باہر تشریف لائے، اوّل ایک پلنگ پر صاف ستھرا بستر بچھوایا اس کے بعد مہمان محترم کی پذیرائی فرمائی،

شان پذیرائی غور سے سنو، اب یہ واقعے کہان، دیکھنا درکنار سنو گے بھی نہین، اپنے بھتیجے حافظ اسعد اللہ خان کو بھیجکر کنوئین سے تازہ پانی منگوایا، مہمان گرامی کے پانون پر عزیز سے پانی ڈلوایا اپنے ہاتھ سے دھوئے، سقاہ اللہ تعالیٰ کا شادہاً فاً ابھی کریم النفسی کی داستان باقی ہے، رامپوری فاضل اجل نے راوی سے یہ واقعہ بیان فرمایا تو یون کہا کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے بڑا کرم فرمایا ایسی دھوپ مین تکلیف فرمائی، اور وہ بھی پیادہ پا، اپنی خدمت کا تذکرہ درکنار اشارہ بھی نہ کیا، ایک موقع پر حسب روایت راوی موصوف نے مفتی صاحب سے مولوی صاحب کی شکرگذاری کا ذکر کیا تو فرمایا کہ مین نے کیا کرم کیا مجھکو تو دوپہر کہین بسر کرنی تھی وہین چلا گیا، کرم تو مولوی صاحب نے فرمایا کہ گھر پانی منگوانے اور پانون دھلانے کا واقعہ بیان فرمایا، دیکھو یہ تھے وہ پاک مشرب صاف سینے جنکے علمی فیض کے

نے نہین دریا بہے، رحمہما اللہ تعالیٰ،

آدم بر سرِ مطلب، مزاج شگفتہ تھا، باذاق تھا، تکلف سے بری تھے، خاص صحبتون مین مزاح بھی فرماتے شعر کا ذوق پورا تھا، خاص صحبتون مین اشعار کا ذکر چھڑ جاتا تو گھڑیون جاری رہتا، اشعار لطیف پڑھتے، لطف خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے، عربی، فارسی، اردو ادب سے یکسان ذوق تھا، مجھکو یاد ہے کہ ایک صحبت مین ہوشم اور دوشم کی طرح پر بہت سے مطلع استادون کے پڑھے تھے، دو مطلعے اب تک یاد ہین، صائب ؎

نمی دانم کرا دیدم کہ از خود می رود ہوشم	جنون آہستہ می گوید مبارک باد در گوشم

لاادری ؎

بیک پیمانہ ساقی کرد مدہوش انجنان دوشم	کہ از محفل حریفان چون سبو بردند بر دوشم

مولوی فیض الحسن سہارنپوری، ؎

صلا زدم کہ من آزادۂ نمد پوشم	غلام حیدرم و جام حیدری نوشم

جام حیدری کی تعریف فرمائی،

گفتگو ہر شخص سے علی قدر مراتب شفقت و محبت سے فرماتے جسکا اثر سامع محسوس کر کے محظوظ ہوتا، تعلّی اور ادعا کا شائبہ بھی کلام مین نہ پایا جاتا، تقدس مآبی اور جلوہ نمائی پاس نہ تھی، تلاوت کلام مجید بھی تخلیے مین فرماتے، سخت کلامی اور فحش الفاظ غصے مین بھی زبان سے نہ نکلتے، ملازمون کے لیے انتہائی غصے کے الفاظ یہ تھے، تمکو کیا ہوا ہو گیا ہے "بالائق ہو" (گویا نالائق کا نعم البدل ہے)

سیر چشم اور فیاض تھے، اسی لیے اکثر قرض کا بار رہتا، حیدرآباد کے تعلق کے زمانے مین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ بھی کفایت کرتی، شادیون مین دعوتین بڑے حوصلے سے ہوتین، جنکو رؤسا بھی مان جاتے، شادی کی تقریبون مین تلامذہ کا اجتماع قابل دید ہوتا، جنمین بڑے بڑے علما ہوتے، سب کے سب مہمانون کی خدمت بے تکلف

کرتے، مولوی ہی پلنگ بچھاتے دوسرا سامان آسایش مہیا کرتے، ایک تقریب مین میرے قیامگاہ مین مولوی ظہور الاسلام

صاحب فتحپوری مرحوم سامان لائے تو مین نے معذرت کی اور کہا کہ آپ تکلیف نہ کرین، ہنسکر فرمایا یہان مولویون کے

سواے کون جو تمہارا کام کریگا،

ایک تقریب مین شام کے وقت مین نے دیکھا کہ متعدد چارپائیون پر تلامذہ بیٹھے ہوئے تھے، ان مین مولوی

سید محمد علی صاحب، مولوی عبد الغنی خان صاحب، مولوی احمد حسن صاحب، مولوی عبد الجمیل صاحب افغانی

مدرس ویلور مدراس) مولوی سید ظہور الاسلام صاحب وغیرہم تھے آج ان کی نظیر سارے ہندوستان مین مشکل سے

ملیگی، ایک کایستھ شاگرد بھی تھے جسے برادرانہ برتاؤ ہو رہا تھا،

ضروری واقعات سے باخبر رہنا اور حسب موقع ان مین حصہ لینا داخل اخلاق تھا، جو خلاصے جنتریون

کے میرے سامنے ہین وہ اس کے شاہد ہین، ایک اندراج میرا سرمایہ نازش ہے "۳ مارچ ۱۸۹۱ء حبیب الرحمن

خان نے پڑھنا شروع کیا:

علماے معاصرین کے علم وفضل کا اعتراف شامل وضع تھا، سب کے ساتھ محبت تھی، انکی وفات سے بہت

متاثر و متاسف ہوتے، جنتریون کے اندراجون مین مولوی عبد الحی صاحب فرنگی محلی، مولوی فیض الحسن صاحب

سہارنپوری، مولوی ارشاد حسین صاحب رامپوری وغیرہم کی وفات کا صدمہ صاف عیان ہے، رحمہم اللہ تعالی

مولوی اسمٰعیل صاحب اسرائیلی سے حالانکہ بے لطفی رہتی تھی، مگر دلّی سے جب ان کے وفات کی خبر آئی تو بے اختیار

آنکھون سے آنسو جاری تھے اور فرماتے تھے "مولوی اسمٰعیل اپنی ذات سے بہت اچھے آدمی تھے"،

بازار کے چٹ پٹے کباب بہت مرغوب تھے، فرمایش ہوتی کہ دلّی کی جامع مسجد کی سیڑھیون کے کباب

گرما گرم آئین، عزیز شاگرد اہتمام کرکے لاتے اور دعائین لیتے، حالت علالت مین یہ شوق معالج اور تیمار دارون

کے لیے مصیبت ہو جاتا، باورچی خانہ مین عمدہ سیخ کے کباب تیار کرائے جاتے، پسند نہ ہوتے،

درس | مفتی صاحب کا مخصوص کمال درس تھا، اللہ تعالی نے عمر دراز بخشی، صحت و قوت وافر عطا فرمائی، علم کی

دولت سے مالا مال فرمایا، یہ سارا سرمایہ تدریس و تعلیم مین صرف فرما دیا، معتبر شہادت اسکی موجود ہے کہ شباب تدریس کے وقت

روزانہ بیس بیس سبق روزانہ پڑھائے، مولوی فضل حق صاحب مرحوم خیرآبادی کا ایک خط میرے پاس ہے، اس مین

تحریر فرماتے ہین کہ آجکل درس قوت سے جاری ہے، ستّرہ سبق روزانہ پڑھائے جاتے ہین، یہ قیام الور کا واقعہ تھا

ٹونک مین درس کا سلسلہ ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ تک ستائیس سال جاری رہا، اس سے پہلے سات برس فیض عام

کانپور مین درس دیا جا چکا تھا، اس طرح چونتیس برس پوری قوت کے ساتھ مجلس تدریس گرم رہی، برسون یہ معمول

رہا کہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر جامع مسجد مین تدریس شروع فرما دیتے، دوپہر کا کھانا وہین آجاتا، عشاء پڑھکر

مسجد سے مکان تشریف لیجاتے،

طلباء کو مطالعے کی تاکید رہتی، اگر کسی طالب علم کی خامی ثابت ہوتی اس کا سبق ناغہ کر دیا جاتا، فرماتے کل

مطالعہ دیکھکر پڑھنا، یہ فرمایش تلخی یا سختی سے نہ ہوتی بلکہ نرمی سے یون فرماتے آج شاید مطالعہ نہین کیا جو مطلب

سمجھنے مین دشواری ہوتی ہے کل مطالعہ دیکھکر پڑھنا، یہ روک ٹوک کا سلسلہ خوبی سے ہمیشہ جاری رہتا، منجھلے فرزند

مولوی عنایت اللہ صاحب درس دے کر بھوپال مین مفتی مقرر ہو چکے ہین، اس زمانے مین ایک خط مین مصئون

بروزن مسئول قلم سے نکلا، مفتی صاحب نے لکھا کہ مصئون بروزن مقول ہے ہمزہ کیون لکھا،

ایک اور والا نامے مین فرماتے ہین، (خلاصۃً) عنایت اللہ اپنی تعظیم مین نہین چاہتا تمھاری تحریر کی شایستگی

کے خیال سے لکھتا ہون کہ بڑون کے خط مین آخر والسلام کے ساتھ کوئی لفظ تعظیمی لکھدیا کرو مثلاً بالاکرام، برابر

والون کو مثلاً "ختم الکلام"

قاضی حسام الدین کشمیری سات برس حاضر درس رہے، اپنی یادداشت مین لکھتے ہین کہ اس عرصۂ دراز مین

صرف دو یا تین بار طلبا کی کج بحثی پر مولوی صاحب کو غصہ آتے مین نے دیکھا، اسی کے ساتھ دوسرے وقت شفقت

سے اسکو مطلب سمجھا دیا،

تدریس کے وقت وقار و تمکین کے ساتھ نشست فرماتے، گھٹنون برابر ایک پہلو سے بیٹھے رہتے، کتاب

ہمیشہ ہاتھ مین کھلی رہتی، جماعت مین باری باری سے ایک طالب علم قاری ہوتا، باقی سامع، الحمد للہ کہ مجھ کو بھی بارہا قاری ہونے کا شرف حاصل ہوا، قاری عبارت پڑھکر ترجمہ کرتا، اس کے خاموش ہونے پر تقریر شروع ہوتی، تقریر صاف سلیس اور بسیط ہوتی، طویل نہین، لہجے سے شفقت اور فیض رسانی کا لطف محسوس ہوتا، ذہین طلبا کے لیے پہلی تقریر کافی ہوتی، جو نہ سمجھتے ان کے لیے دوبارہ سہ بارہ تقریر فرماتے، بشاشت مین فرق نہ آتا، اعتراضون کا جواب نرمی اور تحمل سے دیا جاتا، تمام مراحل طے ہونے پر طلبہ سے دریافت فرماتے سب نے مطلب سمجھ لیا، جواب اثبات مین ملتا تو آگے پڑھنے کا حکم ہوتا، خوبی تقریر پر درس مین مینے یہ دیکھی کہ قاضی مبارک، حمد اللہ، میر زاہد رسالہ اور غلام یحیی کے دقیق مطالب پانی ہو کر روان ہوتے تھے، حالت درس مین کوئی خاص ملنے والے آجاتے تو درس بند کر کے انکی جانب متوجہ ہو جاتے،

ایک بار مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی تشریف لے آئے، حسب عادت درس بند کر کے متوجہ ہو کر پذیرائی فرمائی، مزاج پرسی وغیرہ رسمی مراتب گفتگو کے بعد فاضل خیرآبادی نے فرمایا کہ طلبا کا وقت بہت عزیز ہے، ہرج نہ فرمائیے، قاضی مبارک کا درس ہونے لگا، خیرآبادی مولوی صاحب سنتے رہے، ختم ہونے پر طلبا سے کہا کہ تمھارے استاد کی تقریر ایسی ہے کہ اعتراض خود بخود دفع ہوتے جاتے ہین، جب کوئی معرکہ کا مسئلہ آنے والا ہوتا تو طلبا سے فرما دیتے کہ مطالعہ اہتمام سے کرنا، کل فلان مشکل مسئلے پر گفتگو ہوگی، دوسرے روز تقریر ہوتی تو خود اشکال مشکل مین پڑ جاتا، مسئلے کی صاف واضح صورت ذہن مین آجاتی، ایسے موقع پر دوسرے اساتذہ کی تقریرین بھی بیان فرماتے مگر ان پر جرح قدح نہ فرماتے، طلبا کو خود اندازہ ہو جاتا کہ کون سی تقریر کس پایے کی ہے، قاضی سعدالدین مرحوم نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ان کے درس کے زمانے مین بیجو بکاری کا نسخہ کھلا ہوا سیدھے ہاتھ مین پڑھانے کے پورے وقت تک رہتا، یہ وقت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے کم نہ ہوتا، حالت درس مین بھی شگفتگی اور تواضع کا جلوہ نظر آتا،

درس کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام علوم یکسان قوت سے پڑھاتے تھے، ریاضی کے درس کا تفوق مسلم تھا، مطالعے سے ہیئت جدید کے مسائل پر بھی پورا عبور حاصل فرما لیا تھا، متعدد نقشے سیارون کی تقویم کے (جدید نظام

کے مطابق) یاد داشتون مین موجود ہین، فرماتے تھے قدرت کی وسعت جدید علم ہیئت مین پائی جاتی ہے، قدیم ہیئت نے تو تمام کائنات کو نو دس کرون مین بند کر دیا ہے،

بڑی اور چھوٹی کتابین ایک ہی توجہ سے پڑھائی جاتین، ایک بار لڑکپن مین اپنے عم محترم مولوی عبد الشکور خان صاحب مرحوم کے ساتھ مین ایک بار چند روز علی گڈھ رہا تھا، ہرج سبق کے لحاظ سے ممدوح نے فرمایش کی کہ کوئی طالب علم سبق پڑھانے پر مقرر کر دیے جائین، زہے قسمت کہ حضرت نے خود تکلیف فرمائی، بعد مغرب تشریف لا کر سبق پڑھا دیتے، اس وقت مین بدیع المیزان پڑھتا تھا، پہلے روز دیباچہ پڑھوا کر سنا، مین نے مولف کی نسبت تلبنی، تلبنی بروزن زینبی پڑھی، فرمایا "تلنب بروزن سرنگ، نسبت اسکی طرف تُلُنبی"، اس واقعہ کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گذر چکا، اس لفظ کے ادا فرمانے کی آواز آج گویا کانون مین گونج رہی ہے اور لفظ تلنبی کو دونون لب ملا کر ادا فرمانا گویا اس وقت آنکھین دیکھتی ہین، یہ تھا سمجھانے کا دل نشین انداز، رحمہ اللہ تعالی،

درس کی ہر فنی قوت کا اندازہ ذیل کے دو واقعون سے کرو، یہ دونون واقعے مولوی سید عبداللطیف صاحب میرے ہمدرس نے بیان کئے ہین،

ایک مولوی سید محمد علی صاحب مرحوم کانپوری کی زبانی، مولوی صاحب صحاح ستہ کا دور علی گڈھ مین ختم کر کے سہارنپور مولوی احمد علی صاحب مرحوم سے حدیث پڑھنے گئے تھے، چنانچہ دورہ ختم کر کے سند حاصل کی، فرماتے تھے کہ سہارنپور مین رجال اور اسانید کی تحقیق علیگڈھ سے زائد تھی، مگر کتاب اور حدیث کا مطلب اتنا ہی تھا جتنا علی گڈھ مین تھا،

دوسرا واقعہ خود ان کے والد کی زبانی، موصوف نے علی گڈھ مین ادب عربی دوسرے فنون کے ساتھ پڑھا تھا، یہان سے جا کر لاہور مین مولوی فیض الحسن صاحب مرحوم ادیب نامور سے پڑھا، بعد فراغ کہا کرتے تھے کہ لاہور مین ایام عرب وغیرہ کا بیان بیشک بیشتر تھا، لیکن اشعار کا مطلب علیگڈھ کے درس سے زیادہ نہ تھا، انتہی، مولوی صاحب کو ملا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہ اللہ کی کتابدانی اور حل مطالب کا اعتراف تھا،

تکفیر سے احتراز مولوی صاحب کا مشرب بہت وسیع تھا، کبھی کسی کی تکفیر سے قلم کو آلودہ نہین فرمایا، نہ کبھی مسائل اختلافی کے مباحث مین حصہ لیا، حیدرآباد سے ایک خط مین فرزند دلبند کو لکھتے ہین کہ حلت زاغ کے مسئلے مین مخالف اور موافق دونون فریق مجھکو لکھ رہے ہین اور میری راے کے جویا ہین، مگر مین اس اختلافی مسئلے پر کچھ نہ لکھونگا، اسی وسعت مشرب کا ظہور ندوۃ العلما کے قیام و ترقی مین ہوا،

تصنیف کبھی کوئی تصنیف نہین کی، تمام وقت اور قوت علمی پڑھانے مین صرف فرمادی۔

فارسی شعر کہتے تھے، زیادہ تر تاریخین بعض منظوم خط شاگردون کے نام محفوظ ہین، کلام صاف حشو و زوائد سے پاک ہے، ایک نعتیہ شعر سن لو ؂

مرا بسوے خود اے فخر انبیا برکش   کہ برتری ز سلیمان و کمترم از مور

جملہ معترضہ، انگریزی اس قدر جانتے تھے کہ بوقت ضرورت تار وغیرہ پڑھ لیتے تھے، مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم جس زمانے مین کانپور مین مدرس تھے، ایک سال وبائی ہیضہ وہان پھیلا، موصوف نے ایک تار اسی اثنا مین اپنے والد بزرگوار کے نام کسی ضرورت سے بھیجا، مولوی صاحب تار پاکر قدرۃً گھبرا گئے، مضطربانہ ایک بابو کے پاس جاکر پڑھوایا، اسی روز ارادہ کیا کہ انگریزی اتنی حاصل کرلینی چاہئے کہ ایسی ضرورتون مین محتاجی نہ رہے، چنانچہ بطور خود مطالعہ کرکے استعداد حاصل فرمالی،

ندوۃ العلماء کی صدارت ندوۃ العلما جیسی ہمہ گیر مجلس کی صدارت کے لیے ایسا ہی مقبول عام صدر نشین زیبا تھا جیسے کہ مفتی صاحب تھے، اس مجلس کی بنیاد مدرسہ فیض عام کانپور کی دستار بندی کے جلسون مین پڑی تھی، اور پڑھ چکے ہو کہ یہ مدرسہ سات برس مفتی صاحب کے درس سے فیضیاب رہا تھا،

شوال ۱۳۱۱ھ مین پہلا اجلاس ہوا، یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع مین خود اپنی نظیر تھا، ایک شان تو یہی تھی کہ ہر فرقے کے صنادید علما شریک جلسہ تھے، علماے حنفی کے علاوہ اہل حدیث مین سے مولوی ابراہیم آروی مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی، شیعہ مجتہدین مین مولوی غلام الحسنین صاحب کنتوری شریک جلسہ تھے،

بہ ایں ہمہ یہ نظارہ دیدنی تھا کہ تمام علما بلا تخصیص فرقہ صدر نشین کی تعظیم و توقیر مین یکسان سرگرم تھے، کرسی صدارت حضرت کے جمال و کمال دونون پر نازان تھی، تحریک صدارت مولوی عبد اللہ صاحب ناظم دینیات محمڈن کالج علی گڈھ نے کی، تائید ثانی شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے کی تقریر تائیدی مین یہ الفاظ بھی تھے:- ... مولنا محمد لطف اللہ صاحب کو چونکہ خداوند تعالی نے بسبب عمر و علم کے بزرگی بخشی ہے اور ان کے نام سے خود لطف اللہ مترشح ہے، لہذا ہمارے واسطے ایسے بزرگ کا میر مجلس ہونا باعث خیر و برکات اور لطف اللہ ہوگا،" مولوی شبلی صاحب بھی موید مین تھے اس موقع پر جو رسالہ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی نے پیش کیا تھا اس مین مفتی عنایت احمد صاحب مولوی لطف اللہ صاحب اور مولوی احمد حسن صاحب کی بڑی شاندار الفاظ مین مدح و ثنا کی تھی،

اس جلسے مین ایک واقعہ قابل بیان پیش آیا، سہ پہر کے اجلاس مین جب مفتی صاحب داخل ہوئے تو دیکھا کہ عام شرکا کی صف مین دو یورپین بھی بیٹھے ہین، دریافت سے معلوم ہوا کہ پادری ہین، مولوی صاحب نے علما کی نشستگاہ پر پہنچکر فرمایا کہ چونکہ یہ دونون بھی اپنے مذہب کے عالم ہین لہذا اس نشستگاہ پر بیٹھنے کی اجازت دیجائے، چنانچہ سب نے منظور فرمایا اور دونون صاحب اوپر آکر بیٹھ گئے۔

دوسرے سال اجلاس لکھنؤ مین شرکت سے معذوری رہی، تیسرے برس بریلی کے اجلاس کی صدارت فرمائی، یہ اجلاس بھی اپنی شان مین یادگار رہا، مخالفت کا دور یہین سے شروع ہوا، ان اجلاسون مین خطبۂ صدارت کا فقدان برابر محسوس کیا گیا،

اولاد مفتی صاحب کی شادی جلیسر مین سید رونق علی صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، اس طرح صاحبزادون کی والدہ اور دادی دونون سیدہ تھین،

اولاد مین چھ لڑکے تھے، لڑکیان علاوہ، لڑکون مین محمد کرامت اللہ کا اوائل عمر مین انتقال ہوگیا تھا، سب مین بڑے مولوی عبدالقادر مرحوم تھے، اٹھارہ برس کی عمر مین درس نظامی سے فارغ ہوئے، مولوی عبدالغنی خانصاحب اور اپنے والد ماجد کے شاگرد تھے، حضرت مولنا فضل رحمن مجددی قدس سرہ سے

بیعت تھی، مولوی عبد الحی صاحب مرحوم فرنگی محلی سے مباحث علمی پر مراسلت رہتی، مدرسۂ فیض عام کانپور مین صدر مدرس رہے، علم رمل سے خوب واقف تھے، ۴۰ برس کی عمر مین دق کے مرض سے ۱۳۰۳ھ مین وفات پائی، [illegible] کہتے تھے، ایک شعر سن لو ؎

دلِ من شاد گردیدن نداند | مگر این غنچہ خندیدن نداند

منجھلے مولوی عنایت اللہ صاحب، حکیم و حافظ تھے، اپنے بڑے بھائی اور والد ماجد کے شاگرد تھے، طب سے خداداد مناسبت تھی، علاج خوب کرتے تھے، جامع مسجد مین اپنے والد کی جگہ تقرر، حیدر آباد کے زمانے مین [illegible] صدر مدرس رہے، وہان سے بھوپال جاکر اول رکن مجلس العلما، اس کے بعد مفتی مقرر ہوئے، وہین ۱۹۳۰ء مین [illegible] سرکار عالیہ سلطان جہان بیگم صاحبہ کے ہمراہ حج و زیارت سے مشرف ہوئے تھے، وہان کے علما سے کلام اللہ، حدیث، قصیدہ بردہ و دلائل الخیرات وغیرہ کی سندین لائے تھے،

تیسرے مولوی امانت اللہ صاحب، فارغ التحصیل ہوے، والد اور منجھلے بھائی کے شاگرد تھے، [illegible] ہم سبق رہا، حیدر آباد مفتی صاحب کے ساتھ گئے اور فارغ التحصیل ہو کر لوٹے، منجھلے بھائی کے بھوپال جانے پر جامع مسجد مین صدر مدرس مقرر ہوئے، برسون پورے انہماک اور اہتمام کے ساتھ جملہ علوم کا درس دیا، خاندانی فن [illegible] مین امتیاز تھا، بہت خاموش اور باوضع تھے، پورے مدرس تھے، سوائے پڑھانے کے کوئی مشغلہ محبوب نہ تھا، باسٹھ برس کی عمر کا سرمایہ دو لفظ ہین، پڑھا اور پڑھایا، اپریل سنہ ۱۹۳۱ء مین انتقال کیا، غفر لہم،

چوتھے مولوی سلامت اللہ، عربی کے ساتھ انگریزی بھی پڑھی، درسی کتابین ختم نہ کر سکے، حج سے مشرف ہوئے، عدم فراغ کی تلافی یہ ہے کہ نور نظر مولوی حفیظ اللہ جامع مسجد مین مسندِ تدریس پر بعد فراغ متمکن مین، ریاضی مین ترقی کر رہے ہین،

سب سے چھوٹے عبد الحمید، انگریزی فارسی پڑھی، آخر الذکر دونون صاحبزادے بقید حیات ہین [illegible]

مفتی صاحب کی دستار کمال مین ایک طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ پانچ صاحبزادون مین سے تین صاحب تدریس ہوئے، ایک پوتے،

اولاد سے مفتی صاحب کو معمول سے زیادہ محبت تھی، اُن کی تھوڑی سی تکلیف بھی نہ دیکھ سکتے تھے، قضائے الٰہی کی سخت جگر آنکھون کے سامنے پیوند خاک ہو گئے، سب سے زیادہ صدمہ مولوی عبد القادر صاحب کی وفات کا تھا، اور بجا تھا،

تلامذہ

جو درس چونتیس برس مسلسل اور متفرق طور پر ستر برس جاری رہا اس کے فیضیاب تلامذہ کا استقرار کون کر سکتا ہے، خصوصاً جبکہ شمار اور ضبط کی کبھی پروا بھی نہ کی گئی ہو، دریا مصروفِ مواجی رہا، امواج کی شمار کون کرتا،

حضرت کے شاگرد مولوی احمد الدین مدرس مدرسۂ دانپور (باشندۂ سرحد) نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ ایک موقع پر ان کے وطن مین اہل علم کا مجمع تھا، مفتی صاحب کے فضل و کمال کا ذکر ہونے لگا، اسی ضمن مین شاگردون کی کثرت کا مذکور ہوا، سلسلۂ کلام مین سرحد کے ایک خاص وسیع قطعے کے شاگرد شمار کئے گئے، معلوم ہوا کہ شاگرد اور شاگردون کے شاگرد ڈھائی سو کی تعداد مین مصروفِ تدریس تھے، مین اس بیان کو کذب پر محمول نہین کرتا، تم کو اختیار ہے کہ مبالغہ مان کر اپنی ہمت کے مطابق تعداد کم کردو، کتنا ہی گھٹاؤ جو تعداد رہیگی کثیر ہی ہوگی،

خود مفتی صاحب اور صاحبزادون کی تحریر سے تلامذہ کے جو نام معلوم ہو سکے درج ذیل ہین، بعض نام مین نے اپنی یاد سے بھی بڑھائے ہین،

دیکھو گے کہ شاگردون مین بہت سے علما ایسے ہین کہ ان کے تذکرے لکھے جائین تو علم مین اضافہ ہو، صاحبزادگانِ گرامی قدر، مولوی عبد القادر صاحب[1]، مولوی عنایت اللہ صاحب[2]، مولوی امانت اللہ صاحب[3]، مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری[4]، مولوی عبد الغنی خانصاحب مئو رشید آبادی[5]، مولوی احمد حسن صاحب کانپوری[6]، مفتی عبد اللہ صاحب ٹونکی[7]، مولوی سید محمد اسحاق صاحب پٹیالوی[8]، مولوی عبد الحق صاحب حقانی دہلوی[9]، مولوی عبد الحق صاحب فتحپوری[10]، مولوی وحید الزمان خان وقار نواز جنگ[11]، مولوی محمد اسحاق صاحب اسرائیلی[12]، مولوی محمد یعقوب صاحب اسرائیلی[13]، حکیم محمد یوسف اسرائیلی[14]، مولوی سید ظہور الاسلام فتحپوری[15]، مولوی الٰہی بخش پنجابی[16]،

مولوی[17] عبدالقدوس پنجابی، مولوی[18] فضل احمد افغانی، (ریاضی مین ماہر وقت) مولوی[19] آل حسن مرادآبادی، مولوی[20] بشیر احمد صاحب علی گڑھی، اب بھی استاد مکرم کے مدرسے مین سرگرم تدریس ہین، سلمہ اللہ تعالیٰ، مولوی[21] فضل حق صاحب رامپوری صدر مدرس مدرسہ عالیہ رامپور، حکیم[22] عبدالقادر خان شاہجہانپوری افسر الاطباء ریاست بھوپال، مولوی[23] قمرالدین اجمیری مدیر رسالہ مآل التہذیب، مولوی[24] نادرالدین، مولوی[25] شمس الدین پنجابی، مولوی[26] راغب اللہ پانی پتی، مولوی[27] محمد اسحاق صاحب سنبھلی، مولوی[28] ہدایت اللہ جلیسری، مولوی[29] عنایت اللہ پنجابی، مولوی[30] دوست محمد خان ساکن سکندرہ راؤ، مولوی[31] محمد ہاشم سنبھلی (میرے ہمدرس) مولوی سید[32] عبداللطیف صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ (میرے ہمدرس) مولوی[33] نور محمد پنجابی مدرس مدرسہ فتحپور ہنسوہ، عجب صاحبدل ہستی تھی، مولوی[34] الہداد خان بنگالی، مولوی[35] احسان علی بنگالی، مولوی[36] حافظ گوہرالدین، مولوی[37] عبدالفتاح، مولوی[38] حافظ محمد فائق، مولوی[39] ماجد علی مدرس مشہور، مولوی[40] عبدالرزاق بنگالی، مولوی[41] غلام رید پنجابی، مولوی[42] محمد عثمان وزیری، مدرس بھوپال، مولوی[43] محب اللہ صاحب ولایتی خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، مولوی[44] پیر مہر علی شاہ صاحب سجادہ نشین گولڑہ ضلع راولپنڈی، ایک عالم خود ان سے فیض یاب ہے، مولوی[45] امان اللہ کشمیری، قاضی[46] سعدالدین کشمیری، مولوی[47] ابوسعید، مولوی[48] عبداللہ پنجابی، مولوی[49] شرف الدین، مولوی[50] نور محمد سندھی، مولوی[51] عبداللہ قائم گجراتی، مولوی[52] عبدالعزیز مدراسی، مولوی[53] عبدالصمد بنگالی استاد کے شیدائیون مین تھے، قاضی[54] سراج احمد گجراتی، مولوی[55] محمد علی انبیٹھوی، مولوی[56] سبز علی ولایتی، مولوی[57] سیف الرحمن ولایتی صدر مدرس مدرسۂ فتحپوری وغیرہ، مولوی[58] پردل خان ولایتی، مولوی[59] اخلاق احمد سہسوانی، مولوی حافظ[60] محمد صدیق پوربی، مولوی[61] لطف الرحمن بردوانی، ریاست بھوپال مین تعلیم کے ڈائرکٹر رہے، مولوی[62] پیر محمد ولایتی، مدرسہ جامع مسجد کول مین مدرس رہے، مولوی[63] گل محمد ولایتی مدرس الٰہیہ، مولوی[64] حافظ کعب لہیر، مولوی[65] عبداللہ کاشغری، مولوی[66] شیر محمد ولایتی، مولوی[67] احمد الدین ولایتی، مولوی[68] میر عبداللہ ولایتی، مولوی[69] خداداد بنگالی، مولوی[70] خواجہ محمد یوسف وکیل مشہور، مولوی[71] خواجہ محمد اسمٰعیل وکیل، مولوی[72] رفیع الدین وکیل، حکیم[73] رفیع الدین، حکیم[74] شیخ محمد یوسف علی، مولوی[75] قاری کرم الٰہی، فارسی و تجوید کے استاد تھے، مولوی[76] بدرالدین مدرس مسلم یونیورسٹی، مولوی[77] یونس خان رئیس دتاؤلی، مولوی[78] صدیق حسین مدرس مدرسہ جامع مسجد (میرے ہمدرس) مولوی[79] اظہر حسین بہاری حیدرآبادی (میرے ہمدرس اور مولوی شرف الدین استاد حضور نظام مرحوم کے فرزند) تنگ تلامذہ راقم[80] شروانی،

اس درس کی ایک سعادت یہ بھی تھی، کہ اکثر تلامذہ درس نظامی سے فارغ ہو کر گنج مرادآباد مین حضرت مولانا فضل رحمٰن مجددی قدس سرہ سے شرف بیعت حاصل کرتے، مثلاً سابقون اولون مین مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری، مولوی عبدالغنی خانصاحب، مولوی عبدالحق صاحب حقانی، مولوی احمد حسن صاحب (مرید حضرت حاجی صاحب کے تھے، مگر پیر کی اجازت سے حاضرباش آستانۂ مبارک رہے) متوسطین مین مولوی سید ظہور الاسلام صاحب مولوی نور محمد صاحب پنجابی، متاخرین مین مولوی سید عبداللطیف صاحب، خاکسار راقم،

حضرت پیر مرشد کو بھی مفتی صاحب کے حال پر توجہ تھی، ایک بار کی حاضری مین مجھ سے فرمایا کہ مولوی لطف اللہ کو جانتے ہو، عرض کیا، جانتا ہون، فرمایا خدمت کرتے ہو، عرض کی بزرگ خدمت کرتے ہین، دیکھو اس استفسار کی برکت، مفتی صاحب کی آخری حیات مین خاکسار کو بھی خدمت کا شرف حاصل ہوتا رہا، والحمد للہ علیٰ ذالک،

صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ فہرست اپنی کوتاہ دامنی پر شرمسار ہے،

خاتمۂ حاصل کلام | ایک مدرس اعظم کا مرقع سامنے ہے، جس سے تم بہت سے سبق حاصل کر سکتے ہو،

فلسفۂ فقرا

از

جناب ڈاکٹر نواب سر امین جنگ بہادر کے سی آئی ای سی ایس آئی، ایم اے ال ال ڈی حیدرآباد دکن

(۳)

۸- حادثات جسم وجان

اسیطرح زمان ومکان کا اتحاد اوپر بتایا گیا ہے، اوسی طرح اہل تصوف جسم وجان کا اتحاد بتاتے ہین کہ جسم کا اندازہ یا اوسکی پیمایش جان سے ہوتی ہے، مثلاً اگر کسی جانور کو کوئی چوٹ لگے، تو اوس کے درد یعنی اوسکی جان کو صدمہ پہنچا، اوس کا اندازہ جسم پر جو زخم ہوا اوس کے طول وعرض اور گہرائی سے کیا جاتا ہی اگر زخم جیب اتنا ہے، تو درد کسقدر ہوگا، پس زمان ومکان کے مانند جسم وجان بھی توام ہین، ایک دوسرے سے جدا نہین ہین اور نہین ہو سکتے، جہان جسم ہی وہان جان ہی جہان جان ہی وہان جسم ہی، بلکہ یون سمجھا جائے، کہ ہر ظاہر وباطن کے دو پہلو جیسے زمان ومکان ہین، ویسے ہی اوس کے دوسرے دو پہلو جسم وجان ہین حتی کہ بعض ویدانتیون کا خیال ہے کہ مکان جسم کی نشانی ہے اور زمان جان کی، اونھون نے ایک طرف مکان وجسم کو مترادف سمجھ کر دوسرے طرف زمان وجان کو بھی مترادف سمجھا ہی،

۲- بجلی کیا چیز ہے معلوم نہین جو گرمی یا روشنی یا قوت کے طور پر ظاہر ہوتی ہی، ایسا ہی جان کیا چیز ہے معلوم نہین لیکن اوس کا ظہور تین چار بلکہ متعدد مدارج یا حالتون[1] مین ہوتا ہے، جیو، جان، روح، نفس وغیرہ نوعاً ایک ہین اگرچہ درجہ یا حالت ہر ایک کی جداگانہ ہی اور یہ فرض کر لینے کیلئے کوئی امر مانع نہین ہے کہ جیو، جان، روح اور نفس مین باہمی فرق اسی قدر ہے، جسقدر کہ جثہ، جسم، جسد، بدن مین کیا جا سکتا ہے مثلاً فرض کر لیا جا سکتا ہی، کہ درخت مین جیو ہے، کیڑے مین جان ہے، اور گھوڑے مین روح ہی، اور آدمی مین نفس ہے، (یہان معمولی الفاظ فرضی معنون مین استعمال کئے گئے ہین)

[1] الفاظ درجہ وحالت دراصل مترادف ہین، انسان کے جسم کی ایک حالت بخار ہی، اوس کا درجہ (۱۰۱) کہا جاتا ہی جبکہ تھرمامیٹر ناپا جاتا ہی، درجہ سے مراد موجودہ حالت ہی،

کیڑے کے جسم وجان مین جو مغائرت یا مماثلت، غیریت یا یکتائی، پائی جا سکتی ہے، ویسی ہی گھوڑے کے جسد وروح مین اور آدمی کے بدن ونفس مین ہے، اس مفروضہ کے اکثر صوفی اس وجہ سے قائل ہین کہ (صوفیانہ تحقیقات مین جس کا بیان متعاقب ہوگا) جان کے اقسام نہین پائے جاتے، فقط مدارج یا مختلف حالات ہین لیکن جسم کے (مکان وزمان کے احساس کی وجہ سے) اقسام بھی ہین، اور مدارج بھی ہین، یہ مفروضہ اس تاویل کے واسطے ہو کہ قالب بلا روح کوئی شئے نہین ہوا ور نہین ہو سکتا اور علی ہذا القیاس روح بلا قالب کوئی ظاہرہ نہین ہے، اشخاص جو کہتے ہین، کہ ہم نے زید کی روح دیکھی یا ہندہ کی روح سے بات کی، وہ (اگر سچ کہتے ہین تو) زید یا ہندہ کا نام لے کر اعتراف کرتے ہین، کہ اوس کی روح کسی نہ کسی قالب مین اون کو محسوس ہوئی،

۳- اکثر صوفیون کی رائے مین کوئی جسم بے جان نہین ہے نہ کوئی جان بے جسم ہے، ہر جسم جاندار ہی اور ہر جان جسم دار ہے، پتھر یا لوہا پودہ یا درخت پرندہ یا چوپایہ، حیوان یا انسان جن یا ملک، سب کے سب ذی روح بھی ہین، اور ذی جسم بھی، جان یا روح سب مین ایک ہی قسم کی ہے، فقط حالت یا درجہ کا فرق ہے، جیسے گرمی ایک ہی قسم کی تمام اجسام مین ہی لیکن درجہ کا فرق رہتا ہی، جس طرح گرمی کے درجہ کا اندازہ تھرمامیٹر سے ہوتا ہی، ویسا ہی جان یا روح کے درجہ کا اندازہ اوس کے متعلقہ جسم سے ہوتا ہے، جو ہم کو محسوس ہوتا ہے، پس جان جس درجہ کی پتھر مین پائی جاتی ہی اوس سے بڑھ کر درخت مین ہے، جس کا نام (محض امتیاز کے واسطے) ہم نے جیو رکھا ہی اوس سے بڑھ کر درجہ کی جان پرندہ وحیوان مین ہے، جسکو ہم نے روح سے موسوم کیا ہی اوس سے بڑے درجہ کی جان جسکو ہم نفس کہتے ہین انسان مین ہی یقیناً کہا نہین جا سکتا کہ جن وملک کی روح یا نفس کا درجہ انسان کی روح یا نفس کے درجہ سے بڑھ کر ہے یا کم، کیونکہ اکثر انسانون کو اس کا احساس یا ادراک نہین ہے، کہ جن یا ملک کا کوئی جسم ہے یا کیا، جیسا ہم پتھر درخت پرند وغیرہ کے جسم کو دیکھ کر اوس کی جان کے درجہ کا اندازہ سرسری طور سے کر لیتے ہین، ویسا سرسری طور سے بھی اکثر بلکہ بہت سے انسانون کو جن یا ملائکہ کے جسم کو دیکھکر اندازہ کرنے کا موقع نہین ملتا ہی، مگر اس کے یہ معنی نہین ہو سکتے کہ (الف) جن وملک موجود نہین، یا (ب) اگر موجود بھی ہین، تو وہ روح خالص ہین جسم نہین رکھتے ہین یا (ج) اگر اون کا کوئی جسم ہے

تو انسان کو نظر نہین آتا، اکثر صوفیون کا ادعا یہ ہے، کہ جن وملک موجود ہین، انسان کے احساسات وادراکات کے باہر ہین، معدودے چند انسانون کو وہ نظر آتے ہین، اور اون سے وہ راہ ورسم بھی رکھتے ہین،

۴- جن وملک[1] کا اکثر انسانون کو نظر نہ آنا، اون کی عدم موجودگی کی یا اون کا کوئی جسم یا قالب ہونیکی کوئی دلیل نہین ہے، ڈینوسارس ایک عجیب وغریب شکل کا مہیب جانور ہزار ہا من وزن دار پانی مین رہنے والا زمین پر انڈے دینے والا اب کہین بھی نہین پایا جاتا ہی، لیکن اس وجہ سے یہ نہین کہا جا سکتا کہ وہ لاکھون سال قبل روئے زمین پر کہین بھی نہین تھا، کیونکہ اوس کا کالبد اور اوس کے انڈے آثار قدیمہ ڈھونڈنے والون کو ملے ہین جن سے بلاشبہہ ظاہر ہوتا ہی کہ جانور کی بود وباش ہماری اسی زمین پر قدیم القدیم زمانہ مین تھی، ایسا ہی جن وملک کو ڈھونڈنے والے انسان جو اس زمانہ مین بھی ہین، اگرچہ نسبتۃً تعداد مین بہت کم ہین، اونکو جن وملک کے کچھ ایسے آثار ملے ہین اور ملسکتے ہین جن سے ظاہر ہوتا ہی کہ جن وملک موجود ہین اور ایسے وابستے ہین جن سے پایا جاتا ہی کہ اونکی روح کا درجہ انسان کی روح یا نفس کے درجہ سے اعلی وارفع ہے، کثیر التعداد انسان ہین جنکو کسی جن یا کسی ملک کے جسم وجان کا کوئی احساس وادراک ہی نہین ہو سکتا، اس کے یہ معنی نہین ہو سکتے کہ جن وملک اس وقت موجود نہین اور نہ کسی وقت موجود تھے، بلکہ یہ معنی ہین کہ بہت سے انسانون کے حواس کا ارتقا اس قدر کامل نہین ہوا ہے اور نہ ان مین ایک خاص ادراک ایسا پیدا ہوا ہے جس سے وہ اُن ہستیون کی موجودگی سے ویسے ہی واقف اور باخبر ہو سکتے ہین، جیسے وہ حواس خمسہ اور دیگر حواس سے ذرہ سے لیکر انسان تک کی ہستیون کے وجود سے واقف اور باخبر ہوتے ہین،

۵- چند ماہ قبل حیدرآباد مین ایک نمائش ہوئی تھی، جہان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ اور دوسرے امراء وعمائدین کے سامنے ایک شخص معمر تیس سال نے اپنی آنکھون کو آٹے کی ٹکیون سے بند کر کے اون پر سیاہ پٹی مضبوط بندھوا کر اپنے سامنے کے ایک سیاہ تختہ پر چاک (CHALK) سے لکھی ہوئی عبارت کو اس طرح صحیح طور پر پڑھا

---

[1] یہان شیطان کا نام تک نہین لیا گیا، کیونکہ وہ بد باطن جانور بھی ہو سکتا ہے، انسان بھی اور جن بھی، تمام مخلوق مین شیطان رجیم ہے،

[2] "حس" و "ادراک" مین فرق یہ ہے کہ حس کوئی چیز کا ہوتا ہے، اور ادراک ہر چیز کے ایک جزو (یا پہلو) سے دوسرے جزو (یا پہلو) مین فرق پانے کا ہوتا ہے،

گویا اپنی کھلی آنکھون سے دیکھ کر پڑھتا تھا، اگر کسی زبان مین جسکو وہ نہین جانتا تھا کوئی عبارت لکھی جاتی تو اُسکو اگرچہ وہ پڑھ نہین سکتا تھا لیکن اوس عبارت کے نیچے بالکل ویسی ہی عبارت اپنے ہاتھ مین چاک لیکر لکھ دیتا تھا، گویا آنکھ سے دیکھ کر اوس نے عبارت نقل کی، چنانچہ اس نے چینی زبان مین لکھی ہوئی عبارت آنکھین بند رہتے پر بھی صحیح طور سے نیچے لکھ دی، اس کے کیا معنی؟ یہی کہ اوس کے دوسرے حواس یا اون مین سے کوئی دو ایک حواس اوسکو آنکھون کی بصارت کا کام دیتے تھے، غالبًا اوس کے کان تختہ پر لکھنے کی آواز کے ایسے مانوس ہو گئے تھے، کہ وہ آنکھون سے دیکھ کر پڑھنے کے عوض فقط کان سے سنکر پڑھتا تھا، اکثر گونگے بہرے اشخاص اپنی آنکھون سے دوسرون کی باتین ایسی سمجھ لیتے ہین گویا اونھون نے خود اپنے کانون سے سنکر سمجھا، بہت سے نابینا اشخاص کپڑون کو چھو کر اونکا رنگ صحیح طور سے بتا دیتے ہین، امریکہ والی گونگی دبہری لڑکی مس ہیلین کیلر جو بچپن مین اندھی بھی ہو گئی، اوسکو ٹیلیفون کے موجد پروفیسر بیل نے ایسی تعلیم دی، کہ اب وہ چند قابل قدر کتب کی مصنفہ ہی اور اوسکو گلاسکو یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری دی ہے، یہ عورت اپنے دوستون کے منہ کے نزدیک اپنے ہاتھ لیجا کر یا اون کے حلق پر ہاتھ رکھکر اون کی باتین سمجھ لیتی ہی، حالانکہ وہ اون کو نہ دیکھ سکتی ہے، نہ اون کی باتین سُن سکتی ہے لیکن جرمن، فرنچ وانگریزی مین بات کرنا سیکھ گئی ہی، سب کچھ لکھ دیتی ہے، دہلی مین ایک معزز ومعمر حکیم ہین جن کی بصارت ایام طفلی مین ہی ضائع ہو گئی، اونھون نے نابینائی کی حالت مین علوم متداولہ کی تحصیل کی (حافظ ومحدث ہین) اور طبابت ایسی سیکھی کہ ان دنون ہند مین اون کے جیسے طبیب بہت کم ہین، وہ اپنے مریضون کے نام اون کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بتا دے سکتے ہین، اور محض نبض سے ایسی تشخیص کرتے ہین کہ صد بینا دران حیران بمانند،

ان تمام تجربون سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ ایک حاسہ کا کام دوسرے حاسہ کا دینا، یا ایک سے زیادہ حاسون کا کام دوسرے حواس سے لینا ممکن ہی، مثلاً بینائی کا کام شنوائی کرتی ہی، اور شنوائی کا کام بینائی، ہمارے حواس مین کہ ایک یا دو ایسی ترقی کر سکتے ہین، کہ دوسرے حواس کا کام خود وہ کر سکتے ہین، ارتقا کے نظریہ کے ثبوتون مین ایک ثبوت یہ بھی ہے، کہ ہمارے چار حواس ذائقہ، شامہ، سامعہ وباصرہ فقط ایک حاسۂ لامسہ سے ارتقا پائے ہین، یعنی چکھنا، سونگھنا، سننا، اور نیز دیکھنا بھی ہے، کہ چند خاص اشیاء سے جسم کا ایک خاص حصہ (عضو) چھو جاتا ہی اور کچھ نہین ذائقہ مین تو کھانے کی چیز

ہماری جیب کو چھوتی ہے، سونگھنے کے لئے اشیاء کی عطریت ناک کے اندر کی جھلی کو چھوتی ہے، سننے کے لئے ہمارے کان کے اندر کی ایک دف پر ہوا کی چوٹ لگتی ہے، دیکھنے کے لئے روشنی کی شعاعین آنکھ کے اندر کی ایک لطیف جھلی کو چھوتی ہین اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چھونے کا اثر مختلف اشیاء سے جسم کے خاص اعضاء پر جداگانہ ہوتا ہے، جسکے باعث [illegible] وبصارت کے سوا اور کوئی حاسہ بھی انسان مین پیدا ہو سکتا ہے جس سے انسان کو اور بھی ایسی ہستیون کا احساس ہو سکتا ہے جیسے کہ جن وملک ہین،

۷۔ دیکھنے سننے سونگھنے چکھنے چھونے کے سوا (تولنے) یعنی کس چیز کا کیا وزن ہی، کونسی چیز نرم ہے کونسی سخت اوسکو انسان کے جسم کے وہ عصبے پا لیتے ہین جو عام طور سے گوشت کہے جاتے ہین، یہ حواس خمسہ کے سوا ایک چھٹا حاسہ ہے، جو عصبی حاسہ کہلاتا ہے، اس کے علاوہ آنکھین جو دیکھنے کی عضو ہین، نہ صرف روشنی و رنگ کی تمیز کرتی ہین، بلکہ شکل و حرکت کا امتیاز بھی، کان نہ صرف آواز سننے کا آلہ ہے، بلکہ آواز کس طرف سے آتی ہے، اوسکی شناخت کا بھی ذریعہ ہے ہماری جلد چمڑے مین نہ صرف چھونے کا حاسہ ہے بلکہ گرمی سردی پانے کی بھی سکت ہی، راقم کو ایک انگریز دوست کے ساتھ جنگلون مین دو ایک ماہ دورہ کرنے کا اتفاق ہوا تھا، اس سے جب پوچھا گیا، کہ اب "وقت کیا ہے" فوراً ہوا سونگھ کر صحیح وقت گھنٹے و منٹ کہدیتا تھا، گویا گھڑی دیکھ کر کہتا ہے، شاذ و نادر ایک دو منٹ کی غلطی ہو جاتی تھی، شب مین جب گہری نیند مین رہتے وقت بھی اوس کو بیدار کرکے وقت دریافت کیا جائے تو بچھونے پر پڑے پڑے آنکھین بند کئے ہوئے بغیر نقا ہوا زور سے ناک مین کھینچ کر صحیح وقت (کبھی کبھی دو ایک منٹ کے فرق سے) بتا دیتا تھا، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اوسمین وقت پہچاننے کی غیر معمولی طاقت پیدا ہو گئی تھی، غرض ایسی بہت سی باتین بیان کیجا سکتی ہین، جو بخوف طوالت یہان ترک کیجاتی ہین، لیکن جس قدر کہ بیان ہوئی ہین، اون سے کیا یہ قیاس صحیح نہ ہوگا، کہ انسان مین ایسے حواس ہین، یا اوسکے موجودہ حواس ایسی ترقی کر سکتے ہین، یا اوس مین ایسے جدید حواس پیدا ہو سکتے ہین، کہ وہ جن و ملک کے جسم و جان کو (جن کو بعض اصحاب محض روح یا ارواح کہتے ہین،) دیکھ سکتے ہین، سن سکتے ہین، سونگھ سکتے ہین، بلکہ چھو بھی سکتے ہین،؟

۸۔ ہم نے حادثات یا حوادث جسم و جان کی بحث کے ضمن مین حواس حقیقی (ارتقا پائے ہوئے حواس) اور

حواس جدید کا تذکرہ سرسری طور سے اس لئے کر دیا تاکہ چلتے چلتے اشارۃً بتا دیا جائے، کہ اہل تصوف کی اصطلاح مین الہام کشف وغیرہ کے دراصل کیا معنی ہو سکتے ہین، ؟ کیا ہم یہ نہین کہہ سکتے کہ انسان بریاضت جسمانی و روحانی جدوجہد اپنے مین ایسے حواس پیدا کر سکتا ہی، یا اپنے حواس کو ایسی ترقی دے سکتا ہے کہ جن سے وہ اون حوادث جسم و جان کو جو جن و ملک تک کہے جاتے ہین، دیکھ سکے، اور اون سے باتین کر سکے، مغربی صوفیا جنکو ناسٹکس Gnostics کہتے ہین وہ دعویٰ کرتے ہین کہ جن و ملک کے سوا دوسری ہستیان بھی کسی نہ کسی طور پر اون کے فہم ادراک مین آسکتی ہین،

۹ تناسبہ

۱۔ حکمائے سلف کے چار یا پانچ عناصر کے عوض اہل سائنس کے پاس بیانوے عناصر محقق ہوئے ہین، حال تک خیال تھا کہ اون کی تعداد اور زیادہ ہے یا ہو سکتی ہے مگر اس سال انگلستان مین ایک ہندی متعلم نے ثابت کر دیا، کہ عناصر کی تعداد بیانوے سے زیادہ ہونا ممکن نہین، اون کے (خواص) کے باہمی (تعلق) کا ایک حیرت خیز ضابطہ (Periodic Law) مرتب ہوا ہے جسمین ہر ایک عنصر کا نمبر یا شمارہ ہی اوس کے خواص کا اور دیگر عناصر سے تعلق کا پتہ دیتا ہے، ہر عنصر کے ایسے چھوٹے ٹکڑے کو جس سے چھوٹا ٹکڑا ہونا ممکن نہین، جزو لا یتجزی کو آٹم کہتے ہین، اندنون اس آٹم کی تشریح خاص خاص آلات و ترکیبون سے جو ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر آٹم بجائے خود ایک نظام ہے، جیسا کہ نظام شمسی Solar System ہے یعنی جس طرح سورج کے اطراف اوس کے سیارے مشتری زہرہ زحل وغیرہ چکر لگاتے پھرتے ہین، اوسی طرح ہر آٹم مین ایک اکہرا و تنہا پروٹن ہے جو بجائے خود ایک آفتاب ہی، اوس کے اطراف سیارون کے مانند الیکٹرون چکر لگاتے پھرتے ہین پروٹن مثبتہ الیکٹریسٹی بجلی کا جوہر ہے، اور الیکٹرن منفیہ الیکٹریسٹی بجلی کے جوہر ہین، ہر آٹم مین پروٹن اکہرا و تنہا رہتا ہے، لیکن اوس کے اطراف پھرنے والے الیکٹرن ایک سے زیادہ ہو سکتے ہین، اون کے پھرنے کے مدار بھی مختلف ہوتے ہین، چنانچہ ہر آٹم کی قیاسی شکل ایسی ہوتی ہی:-

ے عبارت کو سلیس بنانے کے واسطے یہان انگریزی الفاظ الیکٹریسٹی آٹم پروٹن ترجمہ کئے بغیر یون ہی یکسان واحد و جمع استعمال کئے جاتے ہین

۱۔ پروٹن
۲۔ الیکٹرن (اندر کے)
۳۔ الیکٹرن (باہر کے)
الیکٹرن
۴۔ فضار

فضار ۴ ۲ ۱ ۲ ۴ ۳ پروٹن
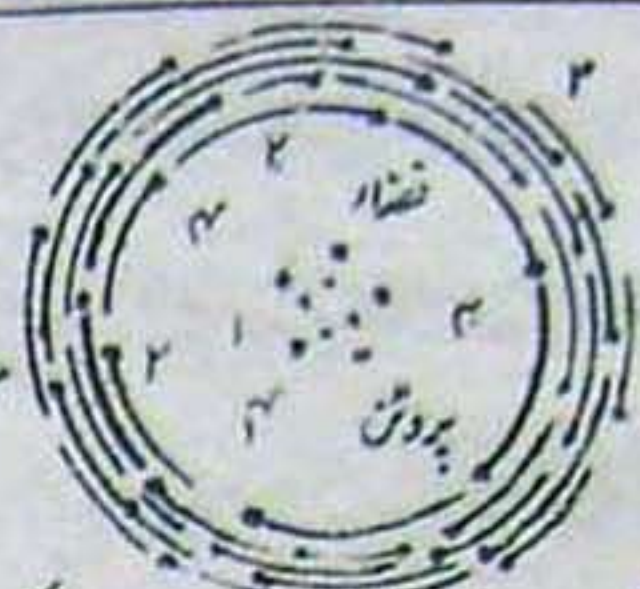
الیکٹرنون کی تعداد اور اون کے مداروں کا فرق ہی ہے، جس سے ایک عنصر کے اٹم مین اور دوسرے عنصر کے اٹم مین امتیاز اور فرق ہو سکتا ہے، مثلاً سونا چاندی دونون عنصر ہین، اون کے جزو لاتجزی اٹم کے پروٹن مین کوئی فرق (مثبتہ الیکٹریسٹی کے اعتبار سے) نہین ہے، شاید بڑا چھوٹا پروٹن ہو تو ہو البتہ سونے کے اٹم مین الیکٹرن کی تعداد چاندی کے اٹم کی تعداد سے زیادہ ہی، اسی لئے سونا الگ چاندی الگ ہی، آجکل یہ خیال بھی سائنس دانون کا ہی (جیسا کہ سابق کیمیا گرون کا تھا) اگر کسی نہ کسی طور سے چاندی کے اٹم مین الیکٹرن کی تعداد بڑھا کر سونے کے اٹم کی تعداد کے موافق کر دیجا سکتی ہے، تو چاندی سونا بن جا سکتی ہی، مگر اب تک ایسا نہ ہو سکا[1]

۲۔ سائنس کی ترقی کے لئے دنیا کے بڑے بڑے مستند علما و فضلا کی ایک انجمن موسوم بہ برٹش اسوسی ایشن ۔۔۔ سال سے قائم ہے، جسکے سالانہ اجلاسون مین سائنس کے ایسے اصول کا اعلان ہوتا رہا ہے، جو بعد مین بہت سے ایجادات و اختراعات کے باعث ہوئے ہین، سال گذشتہ اوس کے ایک جلسہ مین یہ بحث تھی کہ آیا ہماری دنیا کبھی نیست و نابود ہو جاوے گی یا کیا، ایک مشہور منجم نے ہندسی طور سے ثابت کیا کہ ہماری دنیا (نظام شمسی وغیرہ) ہنوز وسیع ہو رہی ہے، چنانچہ ہر لمحہ (ہر سکنڈ) مین اوس کی توسیع (۲۲۰) میل ہو رہی ہے، یعنی ہر روز دو کروڑ تراسی لاکھ میل ہماری دنیا بڑھتی ہے، چوڑی ہوتی جاتی ہے، دوسرون نے بیان کیا کہ اگرچہ ہماری دنیا نیست و نابود ہونے والی ہے، مگر کب ہو گی اوس کے سالون کے شمار کے لئے ایک لکھ کر اوس کے سیدھے طرف اتنے صفر لگانا ہوگا جو دائرۃ المعارف برطانیہ (Encyclopedia Britannica) کی (۳۳) ضخیم جلدون کے تمام صفحات بھر دین گے یعنی دنیا نابود ہونے کے لئے کروڑہا کروڑ ارب در ارب سال گذرنا ہوگا، ایک تیسرے گروہ نے اس کا اعلان کیا کہ اگرچہ تمام اجسام و اجرام چھوٹے بڑے سب کے سب نیست و نابود

[1] نظام کالج کے سابق پروفیسر طبیعیات ڈاکٹر گھوش نامی جو لاڈن کے D. Sc. تھے، اونھون نے راقم کو ایک دھات بتا کر کہا تھا کہ وہ سونا ہے جسکو اونھون نے چاندی سے بنایا،

ہو سکتے ہین، لیکن ہر جسم و ہر جرم کے درمیان جو فضا ہے، اوس مین خلو نہین ہے، بلکہ وہ جان سے بھری ہوئی ہے، اور یہ جان نابود نہین ہو سکتی، لہذا ان دونون سائنس کا رجحان اسطرف ہی کہ کہین خلو نہین اور جہان خلو سمجھا جاتا ہی، وہ حصہ جان سے بھرا ہوا ہے، اور جان کی معدومیت خارج از قیاس ہے، اسی لحاظ سے بعض ویدانتیون کا قول ہے، کہ جو کچھ ہے وہ جان ہی جنکو ہم اجسام و اجرام کہتے ہین وہ سب جان کی شکلین ہین، جو اکثر اوقات بدلتی رہتی ہین، ایسا ہی بعض صوفیون کا اعتقاد ہے، کہ جان لاموت ہی، چنانچہ روز مرہ گفتگو مین فلان مر گیا کہنے کے عوض فلان کا انتقال ہوا جو کہا جاتا ہے، یہ علامت اوس اعتقاد کی پائی جاتی ہے کہ جان مرتی نہین، بلکہ اوسکی ایک حالت سے دوسری حالت مین منتقلی ہوتی ہے، برٹش اسوسی ایشن کے اوس ایک اجلاس مین اس قیاس کا اعلان ہوا کہ ہر اٹم کے پروٹن اور اون کے اطراف پھرنے والے الیکٹرن کے مابین جو فضا ہے، وہ ایک گونہ جان سے بھری ہوئی ہی، یا فضا مین ایک قسم کی کشش جو ہے، وہ روح سمجھی جا سکتی ہے،

۳۔ ویدانتی عناصر اربعہ کے علاوہ ایک پانچوان عنصر آکاس گنتے ہین، جو اثیر جس کا بیان اوپر گذرا ہے اوس کے مشابہ ہے، اور صوفی جو فقط چار عنصر کے قائل ہین، دونون ان عناصر کے ذرون کو اجزاء لاتجزی تصور کر کے جو نظریہ جسم و جان کے تناسب کا قائم کرتے ہین، وہ قریب قریب ایسا ہی ہے، جیسا کہ آٹم کے پروٹم اور الیکٹرن کا تناسب فقرۂ بالا سے ظاہر ہوتا ہے، اس بارہ مین اہل تصوف اور اہل سائنس کے قیاسات کا مقابلہ یون کیا جا سکتا ہی :-

(الف) اہل سائنس کی تشریح آٹم	(ب) اہل تصوف کی تشریح ذرہ
(۱) عناصر کی تعداد = ۹۲	(۱) عناصر کی تعداد = ۴ یا ۵
(۲) عنصر کا جزو لاتجزی = آٹم	(۲) عنصر کا جزو لاتجزی = ذرہ یا رتی
(۳) تشریح آٹم :-	(۳) تشریح ذرہ یا کی :-
یک جوہر = پروٹن مثبتہ الیکٹریسٹی دیگر جوہر = الیکٹرن منفیہ الیکٹریسٹی } توام بوجہ کشش باہمی	یک جوہر = جسم دیگر جوہر = جان } توام بوجہ نسبت یا تعلق باہمی،
(۴) فضا مابین پروٹن و الیکٹرن = باعث	(۴) فضا مابین جسم و جان = باعث

کشش باہمی	نسبت یا تعلق باہمی
وہ کیا؟ روح	وہ کیا؟ حقیقت
(د) مختلف اٹم کیون ہین؟	(ہ) مختلف ذرات کیون ہین؟
یلکٹرن کی تعداد کی کمی یا زیادتی سے،	نسبت جسکو ذات کہہ سکتے ہین اوس کے اثر کی کمی یا زیادتی سے،

(۴) (الف) اہل سائنس کے قیاسات اور (ب) اہل تصوف کے قیاسات کا تقابل محض سرسری طور پر کرنے سے پایاجاتا ہو، کہ دونون مین فی الحقیقت چندان فرق نہین ہے البتہ اصطلاحات والفاظ کا فرق ہے، اور طرز یا طریقۂ ثبوت مین بھی بہت فرق ہے، اسکی بحث طول وطویل ہوسکتی ہے، اوس کو ترک کرکے ہم فقط صوفیون کے نظریۂ تناسبہ کا ذکر کرتے ہین جسکا بہ تقابل بصدر سے ملتا ہو:- وہو ہذا:-

(الف) ذرہ سے پہاڑ سورج سے تارون تک سب مین جسم وجان توام ہین، ان دونون مین سے ہرایک کا کام جو اصطلاحاً وظیفہ[1] کہاجاتا ہے، جداگانہ ہے، جان کا وظیفہ (Function) یا کام جسم کی حفاظت ہو، اوسکو بھلا چنگا رکھنا اوسکو خطرون سے بچانا، جسم کا وظیفہ یا کام، جان کا آلہ بنے رہنا، چنانچہ جسم کے افعال سے ہمکو نہ صرف جان کی موجودگی کا احساس[2] وادراک وعلم ہوتاہے، بلکہ اون سے یہ بھی معلوم ہوتاہے، کہ جان اپنے جسم سے جلب منفعت ودفع مضرت کے افعال کراتی ہے،

---

[1] عالمگیر کے زمانہ مین رائچور کے پاس قریہ گوگی مین ایک صوفی سید محمود بحری رہتے تھے، اونھون نے اپنی مثنوی (من لگن) مین ذات یعنی اللہ کی تعریف یون کی ہے:-

اسے روپ نرا ارتی رتی ہے، پربت پربت پتی پتی ہے،
(پہاڑ)

پربت مین ادگ نہ کم پتی مین یکسار ہے راس اور رتی مین،
(زیادہ) (یکسان) (بہت) (کم)

[2] دیکھو تعلیق فصل ۴ فقرہ (د)، نوٹ احساس وادراک وعلم مین فرق نفسیات کی بات ہے، جسکی توضیح کی یہان ضرورت نہین،

(ب) ہر چیز مرکب ہو عناصر سے اور ہر عنصر کا جزو لا یتجزی جسکو صوفی ذرہ ویدانتی ذرتی اور سائنس آٹم کہتا ہے، اہین بھی دو توام جوہر ہین جنکو صوفی جوہر جسم اور جوہر جان کہتے رہے، لیکن ان کو سائنس پروٹن اور یلکٹرن کہتا ہے، ان دونون جوہرون مین باہمی تعلق (باہمی مناسبت) خواہ وہ مقدار کی ہو، خواہ وہ انجذاب یا کشش کی، خواہ اور کسی قسم کی ہو، اوسکا نام صوفیون نے حقیقت رکھا ہے، اور سائنس اوسکو مظہر روح کہنے پر آمادہ پایاجاتا ہے،

تعلق یا نسبت باہمی

ذرہ = جسم ⟵ ——— ⟶ جان

حقیقت

تجاذب یا کشش ثقل

اٹم = پروٹن ⟵ ——— ⟶ یلکٹرن

روح؟

(ج) حقیقت کیاہے؟ یعنی جسم وجان کے مابین کیا کوئی فضاء ہے اگر ہے تو کیاہے؟ اس بارہ مین اور حقیقت کی تعبیر واطلاق مین اہل تصوف مین بہت کچھ اختلافات ہین، مثلاً ہو الکل کہنے والے صوفی حقیقت کو ذات کہتے ہین، اور ہمہ از اوست کہنے والے صوفی اوس کو مظہر ذات کہتے ہین، ان کے بڑے مباحث ہین جن کا سرسری ذکر بھی یہان صحیح طور سے نہین ہوسکتا کیونکہ یہ الہام القار یا کشف کے محسوسات وادراکات سمجھے جاتے ہین جنکی تعبیر واطلاق مین اختلاف ہو،

۴- جس طرح آئین اسٹین نے اپنے نظریۂ تناسبہ سے بہت سے نتائج حجم وزن تجاذب وغیرہ کی نسبت طبعیات سے متعلق اخذ کئے ہین ویسے ہی بہت سے نتائج صوفیون نے اخلاق والٓہیات سے متعلق اخذ کئے ہین، مثلاً اچھا برا کیا ہو؟ نیکی بری کسکو کہتے ہین؟ تدبیر وتقدیر کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ، ان کا سرسری تذکرہ بھی اس رسالہ کو ایک ضخیم کتاب بنادیگا، یہان صرف خیال پر اکتفا کیجاتی ہے،

۵- بعض ویدانتی وصوفی اپنے کو تعبیر رویا یعنی خواب کی تعبیر کے ماہر سمجھتے ہین، اپنے مریدین ومعتقدین کے خواب کیفیت وغیرہ سن کر ان کی نسبت پیشین گوئی کرتے ہین، مگر اندنون یورپ مین علی الخصوص جرمنی مین چند علماء وفضلاء نے خواب کی تعبیر سے نفس کی باطنی حالت کی تشخیص کرکے نفس کی بیماریان ہسٹریا، مالنخولیا، خبط، جنون وغیرہ کا علاج کرتے ہین،

اونھون نے سائنس کے موافق اور صوفیون نے قرآن شریف کے موافق نفس کے جو طبقات Strata قرار دیے ہیں اونکا مقابلہ حسب ذیل ہوسکتا ہے:-

"ایغو" سے مراد نفس انسان یعنے وہ جو اپنے کو "مین" کے نام سے موسوم کرلیتا ہے،

سائنس حسب قیاس ڈاکٹر فرائیڈ وغیرہ		طبقات النفس	حسب عقیدۂ صوفیہ
۱- ایگون ایغو	ایغو کے جزو عند الموقع ہوجانیوالے عزیزات مثلاً بھوک پیاس شہوۃ خوف غصہ وغیرہ۔		نفس ملہمہ:- جو کشت و کراریگا باعث ہوتا ہے (قرآن ۱۰:...)
۲- مافوق الیغو Censor	برے کامون سے روکنے والا، لعنت ملامت کرنے والا،		نفس لوامہ - (قرآن ۷۵:۲) جو لعنت و ملامت کرنے والا ہے
۳- ایغو Ego	(۱) وقوف Focal Consciousness		نفس مطمئنہ - جو اپنے سے خوش و راضی رہتا ہے (قرآن ۸۹:۲۷)
یعنی وہ جو اپنے کو "مین" کہتا اور سمجھتا ہے	(۲) ماحول وقوف Marginal Consciousness		
	(۳) ماتحت وقوف (حافظ وغیرہ) Recoverable Consciousness		
۴- ماکان الیغو	لا وقوف The Unconsci-ous خواہشات ناجائز یعنی وہ جو کسی وقت ایغو کے جزو بنے تھے، مگر دبا دئے گئے،		نفس امارہ - (قرآن ۱۲:۵۳) جو برے کامون کی طرف رغبت دیتا ہے

لفظ "طبقات" استعارہ ہے اس سے مراد اسی قدر ہے کہ جیسا زمین کے طبقات (مثلاً پتھریلی زمین، ریتیلی زمین، موروم وغیرہ) ہین، ویسے جداگانہ حصص انسان کے نفس کے بھی ہونا فرض کرلئے جاتے ہین اسی طور سے جیسے زید کی جوانمردی بیان کرنے کیلئے کہا جاتا ہے

کہ زید شیر ہے، حالانکہ زید شیر سا جانور نہین ہے، فقط شجاعت شیر کی جیسی رکھتا ہے، ایسا ہی اگرچہ نفس کے طبقے واقعی نہین ہین، لیکن اوسکی حالت کذائی کے بیان کے واسطے اوسکے حصص یا طبقے ہونا قیاس کرلیا جاتا ہے،

نقشۂ بالا کی مزید توضیح و تاویل کی یہان گنجایش نہین، اس سے ظاہر ہوگا کہ صوفیون کی باتون مین اور آجکل کے سائنس کی باتون مین کس قدر معناً موافقت ہے اگرچہ الفاظ مین فرق ہے ؎

ہر حرف اکہ عارف کامل بکس نگفت   در حیرتم کہ بادہ فروش (صاحب نفس) از کجا شنید (حافظ)

طبقات النفس کا سرسری ذکر اس لئے کیا گیا تاکہ ڈاکٹر فرائیڈ اور اون کے شاگردون کے فقط ایک نظریہ کی صراحت کی جائے،

۶- ہر نفس کے (مجازاً) مختلف طبقات ہین، جو اوس نفس والے آدمی کے کردار، اوسکے جسم کے حرکات و سکنات سے پائے جاتے ہین، مذکور الصدر چار طبقات مین ایک اسفل طبقہ ہے، (جس کا نام صوفیون کے پاس نفس امارہ ہے) اور جو نقشہ کے داہنے طرف (ماکان الیغو) سے موسوم ہے، یہ طبقہ اون خواہشات کا ہے، جن کا حصول ناممکن پائے جانے سے طبقۂ اعلی، (مافوق الیغو یعنی نفس لوامہ نے اون کو ایسا دبا دیا (اور وہ اس طرح دب گئے ہین) کہ وہ دوسرے طبقات نفس کے بہت نیچے چلے گئے، اس دباؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیداری کے وقت اون کی یاد مطلق نہین آئی، مگر خواب مین وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی شکل مین ظاہر کرتے ہین، مثلاً ایک نوجوان کہین راستہ چلتے چلتے ایک خوبصورت بازاری عورت کو دیکھتا ہے، تو اوس کے دل مین یعنی نفس مین جو خواہشین اوس عورت کی نسبت فطرۃً پیدا ہوتی ہین، اونکا حصول مختلف و متعدد تحفظات دشواریون کی وجہ سے (مثلاً بدنمائی یا بدنامی کے لحاظ سے) غیر ممکن پاتا ہے، لہذا وہ اون خواہشات کو دبا دیتا ہے، یعنی بالکل بھول جاتا ہے، لیکن وہ خواہشات اوس کے نفس سے بالکل محو نہین ہوتے، بلکہ نفس کے ایک طبقہ مین (جس کا نام لا وقوفی ہے، اس مین) دبے رہ کر کبھی نہ کبھی وہ خواب مین کامیاب یا پورے ہوتے ہین، جسکو عام طور پر احتلام کہتے ہین، غرض فی زماننا یورپ مین علماء کا ایک گروہ ہے، جن کے صدر ڈاکٹر فرائیڈ (DR. FREUD) ہین، جنھون نے تعبیر رویا کے بارہ مین اپنے ذاتی تجربون کی بنا پر ایک مستند کتاب لکھی ہے، جو یورپ کی علمی دنیا مین دلچسپ اور قابل لحاظ سمجھی جاتی ہے، اور اون کے

شاگردوں میں سربرآوردہ ڈاکٹر یونگ DR. JUNG ہیں جنھوں نے اپنے تصانیف میں اپنے تجربون کی بنا پر
اوستاد کی چند باتوں میں اضافہ کیا ہے، چنانچہ اونھوں نے انسانوں کی اون خواہشات کو
(ANIMA) حیوانی تصور کیا ہے، جیسے کہ اوس نوجوان کے خواہشات تھے، جو اوس بازاری عورت کو دیکھ
سے پیدا ہوئے، اور اون لحاظات کو (PERSONA) انسانی سمجھا ہے، جیسے اوس نوجوان کے لحاظات (شرم، حیا) جو
وغیرہ نے اوسکی خواہشات کو دبادیا یا بھلادیا (یعنی اوس کے نفس کے طبقۂ شعوری سے طبقۂ لاشعوری میں پہنچادیا) لیکن بعد میں
سوتے وقت لحاظاتِ نفسی کا دباؤ کم ہونے سے خواہشاتِ حیوانی اوس نوجوان کے خواب اور احتلام کے باعث ہوئے جبہ
ڈاکٹر یونگ نے نیک چلن کا معیار لحاظاتِ انسانی کا غلبہ، اور بدچلن کا معیار خواہشاتِ حیوانی کا غلبہ یون قرار دیا ہے کہ
"جبتک اور جہان تک لحاظاتِ انسانی خواہشاتِ حیوانی پر غالب رہتے ہیں یعنی اون کو دبا رکھتے ہیں یا بھلا
رکھتے ہیں، انسان کے کردار نیک رہتے ہیں، اور جب کبھی خواہشاتِ حیوانی لحاظاتِ انسانی پر غالب آجاتے ہیں، تو افعال
برا اور بتدریج چال بھی بد ہوجاتی ہے"

یہی بات اہلِ تصوف نے صدہا سال قبل تناسبِ جسم و جان کے نظریہ سے بطور نتیجہ اخذ کی تھی، اونھوں نے خواہشاتِ
حیوانی کو فسق و فجور کا باعث سمجھا، اور لحاظاتِ انسانی کو زہد و تقویٰ کا موجب تصور کیا، اور آیۂ کریمہ (سورۂ والشمس ۹۱)
جو اس رسالہ کا زیبِ عنوان ہے، اور جس کا مضمون اس رسالہ کا لب لباب ہے، اوس کو اوس نتیجہ کی دلیل قرار دی، فجور
کی طرف رغبت دلانے والے خواہشاتِ حیوانی کا نام قوای بہیمیہ رکھا، اور تقویٰ کی طرف مائل کرانے والے لحاظاتِ
انسانی کا نام قوای ملکوتی رکھا، اور ڈاکٹر یونگ کے کلیہ کو سالہا سال قبل اس طرح بیان کردیا،

آدمی زادہ طرفہ معجون ست از فرشتہ سرشتہ و ز حیوان،
گر کند میل این، شود کم ازین ور کند قصد آن، شود به ازان،

۱۰- خاتمہ

ا؎ خواب کی مختصر تشریح جو اوپر کیگئی ہو وہ فصل بالا ۳ کی دفعہ (۶) کے بیان سے متعلق ہو، اگر دیا سے مراد یہی ہو، کہ بیداری میں جو خواہشیں

فراموش ہوجاتی ہیں وہ بعد میں سوتے وقت کسی نہ کسی پیرایہ میں پوری ہوتی ہیں جن سے انسان کو ایک قسم کی آفت یا راحت محسوس ہوتی ہو
نوری قبیل کی مگر اوس سے زیادہ آفت و راحت تصوف کی اس امنگ میں محسوس ہوتی ہو جسکی طرح ابتدا ہی میں کردیگئی چنانچہ تصوف کی
امنگ میں نیند کی سی ایک بیہوشی طاری ہوتی ہے، اسمین صوفی کی وہ خواہشین کسی نہ کسی پیرایہ میں پوری ہوتی ہیں، جو اوس کے دل میں "میں
کیا ہوں کون ہوں" وغیرہ سوالوں کے اطمینان بخش جوابوں سے پیدا ہوچکی تھیں اور جنکا پورا ہونا ظاہری ہوش و حواس کی حالت میں ممکن نہ تھا،

رازِ نہان کسی پہ عیان ہو نہیں سکتا ہوجائے عیان بھی تو بیان ہو نہیں سکتا (؟)

فصل و کی دفعہ (۲) میں بیان کیا گیا ہے، کہ تمام فلسفہ کا دار و مدار تین سوالوں کے جوابوں پر ہے، جو نفس اوس کے احوال اور
اوسکے ادراک سے تعلق ہیں، گویا یہ مصادر ہیں جن سے دیگر مسائل مشتق ہیں، غرض ان اصولی سوالات کا ایک ہی جواب ھُو صوفیون کے
پاس ہو، مگر اوسکی توضیح و تفہیم کے لئے اہلِ تصوف کو بھی میدانِ فلسفہ میں قدم رکھنا پڑا، اون کے فلسفہ کا بیان جسقدر ہوسکا اوس سے اندازہ
ہوسکتا ہی کہ اونھوں نے کس حد تک طبعیات، حیاتیات و نفسیات کے فلسفہ کی باتوں کو حل کیا ہے، فقراء کا فلسفۂ روحانیات جو ہے
اوسکے سرسری ذکر کے سوا طوالت کے لحاظ سے کوئی مفصل بحث نہیں کیگئی، اور غلط فہمی کو دور رکھنے کیلئے فقراء کے الٰہیات کے تذکرے سے
بالکل پرہیز کیا گیا، بہرحال امید کیجاتی ہے، کہ اس رسالہ میں جو کچھ بطور مشتے نمونہ از خروارے لکھا گیا ہے، وہ عام فہم و مفید ہوگا،

۲- مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ بصورت امیر و بسیرت فقیر، ویدانتی ہیں اور مولوی سید احمد حسین صاحب امجد
جو صوفی منش نازک خیال شاعر ہیں، اون کا اور چند دوسرے احباب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہو، کہ اونھوں نے براہ کرم اس رسالہ کی
نسبت مشورہ دیا، اور اوسکی عبارت کو صحیح و سہل بنانے میں مدد دی، ان میں ایک صوفی منش خاتون بھی ہیں، جو اپنا نام پردۂ اخفا میں
رکھنا پسند فرماتی ہیں، احبابِ اول الذکر کا میں خاص طور سے ممنون ہوں کہ ان دونوں نے اپنے اشعار متن میں یا حواشی میں لکھنے
کی اجازت دی، تاکہ سوکھا ساکھا مضمون بالکل بے نمک نہ رہے، اگرچہ احباب نے ہر قسم کی تائید فرمائی، لیکن اس رسالہ کی
ہر بات کی صحت یا غلطی کا ذمہ دار ہے احمد حسین امین جنگ،

مشاعرہ

از

مولینا عبد السلام صاحب ندوی

مشرقی ممالک مین شاعری کی ترقی اور شعراء کے مسابقہ و مقابلہ کا ایک بڑا ذریعہ مشاعرہ ہے، زمانۂ جاہلیت مین شعرائے عرب بازار عکاظ مین جمع ہوکر اپنے اپنے قصائد سناتے تھے، اور تمام عرب سے داد و تحسین حاصل کرتے تھے، یہ گویا عرب کا سالانہ مشاعرہ تھا، اسکے بعد جب فارسی شاعری نے بہت زیادہ ترقی کی، اور متوسطین و متاخرین کا دور شروع ہوا تو مشاعرون کا اور بھی زیادہ رواج ہوا، لیکن ان کی صورت بازار عکاظ کے مشاعرون سے مختلف تھی، شعرائے عرب مختلف بحر و قافیہ مین اپنے قصائد سناتے تھے، اور کسی خاص زمین اور طرح کے پابند نہ تھے، لیکن فارسی شعراء ایک خاص بحر اور ایک خاص ردیف و قافیہ کے پابند ہوتے تھے، اور اگرچہ اس طریقہ سے خیالات و مضامین محدود ہوجاتے تھے، تاہم شعراء کی طباعی کا امتحان اس سے نہایت خوبی کے ساتھ ہوسکتا تھا، کیونکہ اس طریقہ سے یہ اندازہ ہوجاتا تھا، کہ ایک ہی قافیہ و ردیف کی پابندی کے ساتھ کس شاعر نے عمدہ مضامین پیدا کئے ہین،

اردو شاعری بھی اس معاملے مین بالکل فارسی شاعری کی مقلد ہے، اور ابتدا سے لیکر آج تک ہندوستان مین اسی طریقے پر مشاعرے ہوتے رہے ہین، اور ہو رہے ہین، بلکہ اب تو یونیورسٹیون کالجون اور اسکولون کی سنجیدہ علمی مجالس کے پہلو بہ پہلو انکو جگہ مل رہی ہے،

عرب مین اسی قدر تھا کہ شعراء کسی ایک موقع پر جمع ہوکر اپنے قصائد سناتے تھے، فارس مین یہ ہوا کہ شعراء کسی باکمال شاعر کے کسی بلند پایہ قصیدہ یا مثنوی کے وزن و قافیہ مین قصیدے اور مثنویان تصنیف کرتے تھے، مثلاً عثمان مختاری

کے اس قصیدہ کے ع

مسلمانان دلے دارم کہ ضائع می شود جانش

خاقانی، امیر خسرو، مولینا جامی وغیرہ بڑے بڑے اساتذہ نے جوابات لکھے ہین، خاقانی نے اس کتاب کے جواب مین یہ قصیدہ لکھا ہے،

دل من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش

اسی طرح کمال اسمٰعیل اصفہانی کے اس قصیدہ کا ع :-

ایکہ از بر سر موی تو دلے اندر داست

خواجہ سلمان وغیرہ فضلاء نے جواب لکھا ہے،

اسی طرح نظامی کے خمسہ کے جواب مین بیسون مثنویان تصنیف ہوئین، اس کے بعد کمال اصفہانی اور سعدی کے زمانہ سے جب غزل گوئی کو ترقی ہوئی، تو شعراء غزلون کے جواب مین غزلین لکھنے لگے، اس قسم کی جوابیہ غزلون مین عموماً مقطع مین جواب کی تصریح کردیجاتی تھی، لیکن اس قسم کے واقعات کو مشاعرہ کے بجائے مطارحہ سمجھنا چاہئے،

مشاعرہ اور مطارحہ دو مختلف المعنی لفظ ہین، مشاعرہ کے معنی باہم شعر خوانی کرنیکے ہین، اس کے لئے کسی مخصوص زمین اور ردیف و قافیہ کے اتحاد کی ضرورت نہین، بلکہ شعراء اگر کسی مجلس مین الگ الگ زمینون مین غزل یا قصیدے پڑھین تو اوس کو مشاعرہ کہہ سکتے ہین، لیکن مطارحہ کے معنی طرح افگندن یعنی بنیاد عمارت قائم کرنے کے ہین، اور عمارت کی بنیاد قائم کرنے کیلئے پہلے سے ایک مجوزہ نقشہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اگر یہ نقشہ کسی مخصوص طرح کی صورت مین ضروری قرار دے لیا جاوے، تو اوس کو مطارحہ کہین گے، لیکن اب عام طور پر مشاعرہ جس کا نام رکھ لیا گیا ہے، وہ مشاعرہ اور مطارحہ دونون کا مجموعہ ہے یعنی کسی ایک طرح یا زمین پر شعراء کا باہم مل کر شعر پڑھنا اس سے اب ہر مشاعرہ کے لئے ایک خاص طرح کی پابندی ضروری ہوگئی ہے، لیکن اس معنی مین مشاعرہ کا رواج فغانی کے زمانہ سے ہوا،[1]

[1] شعر العجم جلد سوم صفحہ ۱۹،

اور شعرائے متاخرین فارسی کے زمانہ مین اوسکو بہت زیادہ ترقی ہوئی، چنانچہ اس زمانے مین اکثر فغانی کی غزلین طرح کی جاتی تھین، اوران مین محتشم کاشی اور عرفی وغیرہ غزلین لکھتے تھے، اور عام مشاعرون مین پڑھتے تھے، شیراز مین ایک دکان گویا شعراء کا دنگل بن گئی تھی، جہان متعدد شعراء جمع ہو کر مشاعرے کرتے تھے، اوران مین عرفی اور غیرتی وغیرہ شریک ہوتے تھے، [illegible] شیراز ہی کی تخصیص نہین بلکہ تمام ایران مین اس کا عام رواج ہو گیا تھا، اور شعراء کی مسابقت و مقابلہ کا [illegible] بن گیا تھا، چنانچہ نظیری نیشاپوری جب خراسان سے کاشان مین آیا، تو یہان کے اساتذہ یعنی حاتم فہمی، مقصود خردہ، شجاع اور رضاعی وغیرہ کے مشاعرون مین جو طرحین دیجاتی تھین، اون مین نظیری بھی شریک ہوتا تھا، چنانچہ انھین غزلون مین سے ایک غزل کا شعر یہ ہے،

زخود ہرگز نیازارم دلے را ٭٭ کہ می ترسم درو جائے تو باشد[۲]

ہندوستان مین بھی فارسی شعراء کے آخری دور مین شاعری کی مجلسین قائم تھین، اور امراء بعض غزلون کو شعراء کے سامنے پیش کرتے تھے، اور وہ اُن کے جواب لکھتے تھے، چنانچہ ملا عبد القادر بدایونی ثنائی مشہدی کے تذکرے مین لکھتے ہین:۔

"پیش از انکہ بہندوستان بیاید بزرگان این دیار بنیے ازو،
غائبانہ بزم می آراستند و در مجلس شعراء او را بتبرک بخوانند"

ایک اور امیر کا یہ شعر نقل کیا ہے،

باریک چو موئیست میانے کہ تو داری، ٭٭ گویا سر آن موست دہانے کہ تو داری،

اور اوس کے بعد لکھا ہے:۔

چون این غزل درمیان انداخت، خیلے از شعرائے آن صوبہ جواب گفتند از انجملہ این است:۔

گفتم کہ گمانیست دہانے کہ تو داری ٭٭ گفتا کہ یقین است گمانے کہ تو داری[۳]

پھر اپنا شعر بھی نقل کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ زمانہ جاہلیت کی شاعری ہے، جس سے توبہ بہتر ہے[۴]، بعض اُمرا

۱ شعر العجم ج سوم ص ۴۲، ۲ ماثر رحیمی جلد سوم ص ۱۱۵ تذکرہ نظیری ۳ بدایونی جلد سوم صفحہ ۲۳۸-۲۳۹،

خود مشہور اساتذہ کی غزلون پر غزلین لکھتے تھے، اور اپنے دربار کے شعراء سے اونکا جواب لکھواتے تھے، مثلاً ایک میر نے شیخ سعدی کی یہ غزل شعراء کے سامنے پیش کی،

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است، ٭٭ ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است،

اور خود اوس کا جواب لکھا اور دوسرے شعرا نے بھی اوس کے جواب لکھے[۱]،

شعراء خود بھی مشہور اساتذہ کی غزلون پر غزلین لکھتے تھے، اور مقطع مین اون غزلون کے مصرعے نقل کر دیتے تھے، چنانچہ صائب کا یہ خاص انداز ہے، مثلاً،

این جواب آن غزل صائب کہ میگوید بیک ٭٭ چشم بینش باز کن تا ہر چہ خواہی بنگری

این جواب مصرع نوعی کہ خاکش سبز باد ٭٭ سایۂ ابر بہاری کشت را سیراب کرد،

اس طریقہ سے خاص خاص زمینون اور خاص خاص طرحون کی پابندی لازمی ہو گئی، چنانچہ ایک امیر نے امیر خسرو کی ایک غزل کا یہ مصرع

از دل بدست رفت و ز ناخن بتار ریخت،

طرح کیا اور شعراء کو اس پر غزل لکھنے کیلئے ایک دن کی مہلت دی، اور دوسرے دن محمد انوری لاہوری، ملا عبد الغنی فخر الزمانی نے غزل لکھکر پیش کی[۲]، اسی طریقہ کی باضابطہ شکل کا دوسرا نام مشاعرہ تھا، اور رفتہ رفتہ یہ باضابطہ شکل بھی قائم ہو گئی، چنانچہ ماثر الامراء مین ایک امیر کے حال مین لکھا ہے:۔

"و در ہر ہفتہ یکبار مشاعرہ مقرر کردہ بود، جمیع شعرائے کشمیر حاضر می شدند، در آخر مجلس شیلانے می کشید[۳]"

لیکن باین ہمہ قدمائے شعرائے اردو یعنی ولی وغیرہ کے زمانے تک کسی مشاعرے کا پتہ نہین چلتا، البتہ جب دلی مین اُردو شاعری کا عام رواج ہوا تو ساتھ ساتھ مشاعرون کی بھی گرم بازاری ہوئی، اور اون مین سب سے زیادہ اہم مشاعرہ خواجہ میر درد کے مکان پر ہوتا تھا، لیکن جب یہ بزم مشاعرہ حوادث زمانہ سے قائم نہ رہ سکی تو خواجہ صاحب کے ایما سے میر تقی کے یہان ہر مہینے کی پندرھوین تاریخ کو ہونے لگی[۴]، اس کے علاوہ اور بھی متعدد

۱ بدایونی جلد سوم صفحہ ۲۸۸ ۲ میخانہ صفحہ ۵۰۶ ۳ ماثر الامرا حصہ دوم صفحہ ۲۷۱ ۴ نکات الشعرا صفحہ ۵۷،

مشاعرے ہوتے تھے، جن کا حال میر نے اپنے تذکرے مین جا بجا لکھا ہے، چنانچہ میر سجاد کے تذکرے مین لکھتے ہین:۔

"قبل ازین بخانۂ او مجلس یاران ریختہ می شد بندہ نیز میرفتم"[1]

میان کمترین کے تذکرے مین فرماتے ہین:۔

"گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ این لفظ بوزن مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود"[2]

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ مین مشاعرہ کو مراختہ کہتے تھے، جو ریختہ سے ماخوذ ہے،

دلی کے تباہ ہونیکے بعد جب لکھنؤ اردو شاعری کا مرکز قرار پایا تو یہان مشاعرون نے اور بھی رونق حاصل کی، بالخصوص شہزادگانِ دلی نے جو لکھنؤ مین آرہے تھے، ان کی رونق کو اور بھی دوبالا کیا، چنانچہ تذکرہ گلشنِ ہند مین مرزا جوان بخت کے حال مین لکھا ہو کہ

"غرض اس شہزادہ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی کہ مہینے مین دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ مین ٹھہرائی تھی، شعرائے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے دن بلواتے، اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرمجوشی سے فرماتے"[3]

مرزا سلیمان شکوہ کی نسبت مصحفی اپنے تذکرہ مین لکھتے ہین:۔

"در ایامے کہ بحکم برترتیب مجلس مشاعرہ شدہ بود، اکثرے از کاروانانِ فن در حضور آمدہ حاضر می شدند، فقیر ہرگز بسوت درویشی بر قامتِ حالِ خود داشت در اوائلِ مشاعرہ بانعام یک دو شالہ و یک تھان سرفرازی یافتہ راہِ خود پیش گرفت"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ مشاعرے امراء کے درباروں مین شعراء کی قدردانی اور اون کے اجتماع بلکہ ملازمت کا بڑا ذریعہ تھے، چنانچہ مصحفی اسی عبارت کے سلسلہ مین اپنے متعلق لکھتے ہین:۔

"این فقیر حقیر ہیچمیرز، نسبت دیگران باوصف گوشہ نشینی درین کار زیادہ رسوائی داشت، بگفتہ انشاء اللہ خان

[1] نکات الشعراء ص۔ [2] ایضاً ص ۱۵۶۔ [3] تذکرہ گلشن ہند ص۔

حسب الطلب حضور باوصف کم شغلی و شکستہ حالی شریک مجلس یاران شدہ بود چنانچہ از ہمان تاریخ در حلقہ ملازمانِ حضور در آمد"

اس لئے یہ شاعری کی ترقی کا بڑا ذریعہ بن گئے تھے،

یہ مشاعرے دار المناظرہ کا کام بھی دیتے تھے، اگرچہ اس حیثیت سے انکے اخلاقی نتائج اچھے نہین ہوتے تھے اسلئے جو لوگ مناظرون کے کانٹون سے اپنے دامن کا الجھانا پسند نہین کرتے تھے، وہ ان مین جانا پسند نہین کرتے تھے، چنانچہ علی ابراہیم خان مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم کو جب مرزا جوان بخت جہاندار شاہ نے اپنے مشاعرے مین طلب کیا تو اونھون نے یہ معذرت کی،:۔

"کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے، از بسکہ ان صحبتون مین مناظرہ ہی کو یارانِ عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے"[1]

تاہم اون کے ذریعہ سے فنِ تنقید کو جو شاعری کا ایک لازمی جزو ہے، نہایت ترقی ہوتی تھی، چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آبحیات مین اس قسم کے بہت سے تنقیدی نکتے لکھے ہین، جو انھین مشاعرون کی پیداوار ہین، مثلاً خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ تھا، سودا نے یہ مطلع پڑھا

آلودہ قطراتِ عرق دیکھ جبین کو، اختر پڑے جھانکے ہین فلک پر سے زمین کو

خان آرزو نے فوراً قدسی کا یہ مطلع پڑھا:۔

آسودہ قطراتِ عرق دیدہ جبین را اختر ز فلک مے نگرد روئے زمین را،

جس سے یہ اشارہ تھا کہ سودا کا مطلع اسی کا ترجمہ یا سرقہ ہے،[2]

شاہ نصیر نے دکن مین کسی کی فرمایش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی، آتش و آب و خاک و باد اپنے مشاعرے مین وہ غزل سنائی اور کہا کہ اس طرح مین جو غزل لکھے مین اوسے اوستاد مانتا ہون، دوسرے مشاعرے مین ذوق نے اس پر غزل پڑھی اور شاہ صاحب کی طرف سے اوس پر کچھ اعتراضات ہوئے، جشن قریب تھا، ذوق نے ایک

[1] تذکرہ گلشن ہند ص۔ [2] آبحیات ص ۱۵۹۔

زمین میں بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، اس پر بھی اعتراضات ہوئے، ذوق نے قصیدہ کو مشاعرہ میں سُنایا کہ وہین برسرِ معرکہ فیصلہ ہوجائے، قصیدہ کا مطلع یہ تھا،

کوہ اور آندھی میں ہون گر آتش و آب و خاک و باد　　آج زچل سکین گے پر آتش و آب و خاک و باد

اوراسپر اعتراضات حسب ذیل تھے،

(۱) سنگ مین آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیے،

(۲) سنگ مین آتش کا ثبوت چاہیے،[۱]

مولینا محمد حسین آزاد نے ان سوالات وجوابات کی جو تقریر کی ہے، اگر وہ صحیح ہے تو شاعری کی حد سے گذر کر منطق وفلسفہ کے حدود مین داخل ہوگئی ہے،

دلی کے ایک مشاعرے مین مرزا غالب نے اپنی فارسی غزل سُنائی، جب یہ مصرع پڑھا:-

بوادی کہ دران خضر را عصا خفت است

تو اوس پر یہ اعتراض ہوا، کہ "عصا خفت است" مین کلام ہے، مرزا نے کہا مین ہندی نژاد ہون میرا عصا پکڑ لیا، اوس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا جس نے کہا اول عصائے شیخ بخفت،

اونھون نے کہا کہ اصل محاورہ مین کلام نہین، کلام اسمین ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہین؟[۲]

یہ مشاعرے شعراء کی مسابقت ومقابلہ کا بھی بڑا ذریعہ تھے، اگرچہ اس مسابقت ومقابلہ سے صحیح طور پر کام نہین لیا گیا، تاہم اسمین شبہہ نہین کہ اردو شعراء نے اوسکی بدولت بڑے بڑے دشوار گذار مرحلے طے کیے، تذکرہ گلستان سخن مین نصیر کے حال مین لکھا ہے:-

"بارہا ہنگامۂ مشاعرہ مین حریف ہنوز انشاد اشعار سے فارغ نہین ہوا کہ اوس نے اوس کوتاہ مدت مین شمع مقابل رکھ کر اشعار موزان تر از شعلۂ شمع بقدر دو تین غزل کے لکھ کر مشتاقان سخن کے گوش گذار کر دیے"

[۱] آبحیات ص ۴۳۳، [۲] ۔ ص ۴۹،

اس مسابقت کا ایک واقعہ اسی تذکرے مین شاہ صاحب کے حال مین لکھا ہے کہ وہ ایک بار لکھنؤ مین آئے تو مصحفی، جرأت اور انشاء سب زندہ تھے، بقول صاحب تذکرہ ہر ایک کے دل مین ہوس مطارحہ پیدا ہوئی اور باہمی مشورے سے آٹھ مصرعے مشکل زمینون مین طرح کرکے شاہ صاحب کے پاس پہنچے، شاہ صاحب انکے ساتھ ہی دردِ گردہ مین مبتلا ہوگئے تھے، مشاعرے کو صرف تین دن باقی رہ گئے تھے، تاہم غیرت کے تقاضے سے نہ صرف ان زمینون مین غزلین کہین بلکہ خود ایک اور غزل لکھی، جسکی ردیف وقافیہ تین کی تھی اور کفن کی کمی تھی اور مشاعرے مین داد وتحسین حاصل کی،

ایک بار شاہ صاحب سفر لکھنؤ سے واپس آئے اور دو غزلین جو شعرائے لکھنؤ کی فرمایش سے کہی تھین ایک مشاعرے مین پڑھین، ان مین ایک کا مطلع اور ایک کا ایک شعر یہ ہے،

ہم بھڑک کر توڑتے سارے قفس کی تیلیان　　پر نہ تھین اے ہمصفیرو اپنے بس کی تیلیان

برہمن اپنے بتون کو بخدا سجدہ نہ کر　　آدمِ مردہ ہین بے گور وکفن پتھر کے،

ان کی بڑی تعریفین ہوئین تو بعض اساتذہ کے دل مین رشک پیدا ہوا اور اپنے شاگردون سے ان دونو زمینون مین غزلین کہلائین، یہ بات شاہ صاحب کو ناگوار ہوئی، اور پہلی زمین مین تقریباً پچاس غزلین کہلا کر اپنے شاگردون کے نام سے آیندہ مشاعرے مین پڑھوائین، اس سے رشک وحسد کا بازار گرم ہوگیا، اور اوس کے بعد شعراء نے بالتزام کر لیا کہ ہر مشاعرہ مین اسی زمین مین غزل طرح ہو، اور لوگ تو صرف آٹھ نو شعر مشاعرے مین پڑھتے تھے لیکن شاہ صاحب ہر بار ساٹھ ستر اشعار کا دوغزلہ پڑھتے تھے، اور اون کے شاگردون کی غزلین بھی جو اونیس بیس شعر سے کم نہ ہوتی تھین اونھین کی طبعزاد ہوتی تھین،[۱]

ان وجوہ کے علاوہ ایک عام مجمع مین شعراء واساتذہ کی داد وتحسین بھی نو مشق شعراء کی ترقی وشہرت کا بہت بڑا ذریعہ تھی، مولوی محمد حسین آزاد نے ذوق کے حال مین لکھا ہے، کہ انھون نے ایک مشاعرے مین ایک غزل پڑھی، تعریف زیادہ ہوئی تو حوصلہ بڑھا، اور بے اصلاح مشاعرے مین غزل پڑھنے لگے اب کلام کا چرچا زیادہ ہوا،

[۱] گلستان سخن ص ۴۵۹، [۲] ۔ ص ۱۹۳،

اور بزرگان پاک طینت جو اساتذہ سلف کی یادگار باقی تھے، مشاعرون مین تعریفین کر کے دل بڑھانے لگے،

لیکن ان تمام باتون کے ساتھ مشاعرون کے اخلاقی نتائج نہایت ناگوار بلکہ خطرناک ہوئے، چنانچہ ایک نواب صاحب کے یہان مشاعرہ تھا، وہ شیخ ناسخ کے معتقد تھے اس لئے ارادہ کیا کہ شیخ صاحب جب غزل پڑھ چکین تو اونھین سر مشاعرہ خلعت دین، لیکن یارون نے خواجہ آتش کے پاس مصرع طرح نہ بھیجا، اونھین مصرع اوس وقت پہنچا جب مشاعرے کو صرف ایک دن باقی تھا، وہ نہایت برہم ہوئے اور شہر کے باہر جا کر ایک مسجد مین جا بیٹھے، اور وہان سے غزل لکھ کر لائے اور مشاعرے مین گئے تو قرابین بھر کر لیتے گئے، اول تو اونکا انداز ہی بانکے سپاہیون کا تھا، اس پر قرابین سامنے بھری ہوئی رکھی تھی، اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہین، بار بار قرابین اوٹھاتے تھے، اور رکھ دیتے تھے، جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر ہو بیٹھے، اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کر کے پڑھا،

سُن تو سہی جہان مین ہے تیرا فسانہ کیا، کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

اس ساری غزل مین کہین اون کے بالک ہونے پر کہین ذخیرۂ دولت پر کہین ان کے سامان امارت پر غرض کچھ نہ کچھ چوٹ ضرور ہے، شیخ صاحب بیچارے دم بخود بیٹھے رہے، نواب صاحب ڈرے کہ خدا جانے یا اون پر قرابین خالی کرین، یا میرے پیٹ مین آگ بھر دین، اوسی وقت داروغہ کو اشارہ کیا کہ دوسرا خلعت خواجہ صاحب کے لئے تیار کرو، غرض دونون صاحبون کو برابر خلعت دیکر رخصت کیا،[1]

اسی رشک و منافست کا یہ نتیجہ تھا کہ دونون بزرگ کبھی ایک مشاعرے مین شریک نہین ہوتے تھے، اور لکھنؤ کے مشاعرون مین اب بھی اس رشک و منافست کے ناگوار مناظر نظر آتے ہین،

دور جدید مین اگرچہ مشاعرے کی قدیم شکل بھی قائم رہی، تاہم اس دور مین اردو شاعری کی اصلاح کے ساتھ مشاعرون کی بھی اصلاح ہوئی، اور سب سے پہلے کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم نے جب اردو شاعری کی اصلاح کی طرف توجہ کی تو اس سلسلے مین اونھون نے ایک بزم مشاعرہ بھی قائم کی جس مین مصرع طرح کے بجائے کوئی خاص مضمون

[1] تذکرۂ آبحیات صفحہ [illegible]

دیا جاتا تھا کہ عاشقانہ مضامین کی جگہ مناظر قدرت اور جذبات انسانی پر شعرا طبع آزمائی کریگین، مولانا حالی اور مولوی محمد حسین آزاد نے جو اس وقت سررشتۂ تعلیم سے متعلق تھے، اس مشاعرے مین خصوصیت کے ساتھ حصہ لیا، اور حب الوطنی اور مناظر قدرت پر چھوٹی چھوٹی مثنویان لکھین، اور اسی مشاعرے کے ذریعہ سے جدید شاعری کا آغاز ہوا، اگرچہ عام طور پر اس قسم کے مشاعرون کا رواج نہ ہو سکا، تاہم اب بھی کبھی کبھی اس قسم کے مشاعرے ہوتے رہتے ہین، جن مین غزل کے بجائے مختلف موضوع پر نظمین پڑھی جاتی ہین، اس لئے ان کے ذریعہ سے ایک نوع کی شاعری کے بجائے مختلف نوع کی شاعری کو ترقی ہوتی ہے،

جب سے ملک مین نئی نئی یونیورسٹیان قائم ہوئی ہین، اور نصاب تعلیم مین اردو زبان داخل ہوئی ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی مشاعرون کی طرف توجہ ہو گئی ہے، بالخصوص طلبہ اس مین زیادہ دلچسپی لینے لگے ہین، چنانچہ تقریباً تمام یونیورسٹیون اور کالجون مین سالانہ مشاعرے ہوتے ہین، اور دور دور سے مشہور شعرا مدعو کئے جاتے ہین، اس لئے اون سے بڑا فائدہ یہ مرتب ہوتا ہے، کہ جدید نسل کو اردو زبان سے بیگانگی نہین پیدا ہونے پاتی، تاہم اس مین شک نہین کہ ان مشاعرون مین بہت سی ایسی باتین پیدا ہو گئی ہین جن پر ہمارے شعرا کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہے، ذیل مین صرف چند امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، اور اون کی تفصیل کسی اور موقع کے لئے اوٹھا رکھی جاتی ہے،

۱- اس طریقہ سے "غزل گوئی" کی طرف شدت انہماک پیدا ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دوسرے اصناف سخن مر گئے،

۲- "غزل گوئی" درحقیقت سچے جذبات کے اظہار کی طالب ہے، مگر اس کی اس ہر دلعزیزی نے یہ کیا کہ ہر بوالہوس کو شاعر بن جانے پر مجبور کر دیا، جس سے شاعری کے وقار کو بہت صدمہ پہنچا،

۳- مشاعرون سے داد و تحسین کے حصول کے ایسے طریقے ایجاد ہوئے، جن کا اخلاقی اثر شعرا کے پورے گروہ پر نہایت برا پڑا، اور اوس کے لئے نہ صرف غیر منصفانہ بلکہ ناروا طریقون سے بھی احتراز نہین برتا جاتا،

(۴) پہلے زمانہ مین مشاعرون کا یہ وقار اور رعب تھا کہ باکمال شعرا یا اون کے منجھے ہوے شاگردون کے سوا کوئی دوسرا شخص ان مجلسون مین اپنا کلام سنانے کی ہمت نہین کر سکتا تھا، مشاعرون مین استادون کے چشم و ابرو کے اشارے دیکھے جاتے تھے، اور اون سے کلام کی صحت و سقم پر استدلال کیا جاتا تھا، مگر آج کل کی خریداری اور فن کی عدم واقفیت نے ہر طفل سوادخوان کو اس کا اہل بنا دیا ہے کہ دو چار فقرے موزون کر کے اہل بزم سے داد حاصل کرے اور اگر نہ ملے تو سخن ناشناسی کا الزام اون پر قائم کر کے دنیائے ادب کی سونی ہو جانے پر ماتم کرے،

یہ تمام امور اہل ادب اور اصحاب شعر و سخن کی توجہ کے مستحق ہین؛

گل رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اوس کی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے اردو شعرا کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو مین شعرا کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے، جسمین آب حیات کی غلطیون کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات ضخامت ۵۴۰ صفحے قیمت ؎

کلیات شبلی اردو

مولینا کی تمام اردو نظمون کا مجموعہ، جسمین مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسون مین پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمین جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہین یکجا ہین، یہ نظمین درحقیقت مسلمانون کے چہل سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی چھپائی کاغذ اعلی ضخامت ۱۶۰ صفحے، قیمت عہ

"منیجر"

حاشیۂ بیضاوی شاہ وجیہ الدین صاحب

معارف کے دو پچھلے پرچون مین حضرت شاہ وجیہ الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جو حالات مولینا سید ابوظفر صاحب ندوی کے قلم سے شائع ہوے ہین، اونھون نے اہل علم مین اس محترم ہستی کے متعلق بڑی دلچسپی پیدا کر دی ہے،

معارف اس پر بجا فخر کر سکتا ہے کہ اوس کے ناظرین مین ایسے ارباب علم ہین، جو اس مین شائع ہونے والے ہر مضمون کو میزان علم مین تولتے، اور محکّ نظر سے پرکھتے ہین،

صاحب مضمون کو شاہ صاحب کے مزار کی تعمیر کے تاریخی مصرع:-

عرش اسلام و قبلۂ مقبل

مین جو غلط فہمی ہوئی تھی، اوسکی تصحیح، نواب صدر یار جنگ مولینا شروانی کے علاوہ مرزا عزیز دارا پوری نے لاہور سے کر کے بھیجی ہے، جو بعینہ وہی ہے جو مارچ کے معارف مین مضمون مذکور کے آغاز مین چھپ چکی ہے،

مضمون نگار نے اپنے علم کے مطابق شاہ صاحب کی تصنیفات کے متعلق یہ لکھا تھا، "کہ شاید ہی کوئی ان مین سے طبع ہوئی ہو" مولینا عبد العزیز صاحب میمن پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی اطلاع دیتے ہین کہ کم از کم انکی ایک کتاب مختصر کافیہ ایسی ہے، جو کسی زمانہ مین بمبئی مین چھپی تھی، اور وہان کے کتبخانون مین اب بھی ملیگی،

صاحب مضمون کو شاہ صاحب کے حاشیۂ بیضاوی کے نہ ملنے کا افسوس رہا اور اون کو اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ مدراس کے کسی بزرگ کے پاس یہ انمول موتی ہے، مگر معارف کو اب تک اس کے دو نسخون کا پتہ چل چکا ہے،

پروفیسر عبد العزیز صاحب میمن فرماتے ہین کہ اون کے پاس اس حاشیہ کا وہ نسخہ تھا، جو خاص مصنف کے نسخے سے منقول تھا، اور اب یہ نسخہ کتبخانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن مین ہے،

نواب صدر یار جنگ رقم فرماتے ہین:-

حاشیۂ موصوف کا پورا نسخہ میرے کتابخانے (واقع حبیب گنج علی گڈہ) مین ہے، خوشخط اور جہان تک دیکھا صحیح ہے، تعداد صفحات (۴۱۷) ہے، فی صفحہ سطر (۲۴) خفی قلم، پہلے چند ورق ایک قلم کے ہین، باقی دوسرے قلم کے، جو زیادہ خوشخط نسخ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کاتب نے چند ورق لکھ کر چھوڑ دئے، دوسرے نے پوری کی، دوسرے کاتب کی تحریر وسط صفحہ سے شروع ہوتی ہے۔

ابتدا یون ہے۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید العالمین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

شرح تفسیر قوار کر کے شروع کرتے ہین، حواشی مختصر، مگر واضح اور موضح ہین،

کاتب نے آخر مین لکھا ہے کہ "تمام شد حاشیۂ میان وجیہ الدین بر تفسیر بیضاوی، بتاریخ ۲۲ شہر ذی حجہ روز دوشنبہ ۱۰۸۲ در احمد آباد"

تلخیص وتبصرہ

"فلسفۂ ہند اور حیات ابدی"

"پروفیسر ای ایس واٹر ہاؤس نے ایک مقالہ بعنوان بالا، رسالہ ٹیچر مین لکھا ہو، اس کی تلخیص اسٹیٹسمین کے حوالہ سے ذیل مین درج کیجاتی ہے،

ویدک لٹریچر سے ہندوستان مین صدیون کے مذہبی ارتقاء کے حالات معلوم ہوتے ہین، اس کے قدیم ترین اور بہترین حصہ مین جو "رگ وید" کے نام سے مشہور ہے، ہمین آسمان سے ماورا ایک ایسی جنت کا حال ملتا ہو، جو ہمارے بچپن کے تخیل کی جنت سے بہت ملتی جلتی ہو،

مرنے کے بعد بہشت مین دیوتاؤن اور انسانون سے ملتے ہین، اور وہان ان کی زندگی ہر قسم کی مسرت اور آسودگی کی زندگی ہوتی ہے، لوگ جو قربانیان دنیا مین کرتے ہین، وہی بہشت مین ان کے لئے سامان غذا بن جاتی ہین، اگرچہ یہ خیالات حضرت مسیح سے کم از کم ایک ہزار سال قبل سے چلے آتے ہین، تاہم وہ اس رائے کی تائید نہین کرتے کہ مذہب کوئی خوف کی چیز تھی، کیونکہ بجز چند مقامات کے جہان برے لوگون کو ایک گڈھے مین ڈال دینے کا ذکر ہے، دوزخ کے متعلق اور کچھ معلوم نہین ہوتا، یہ گڈھا برائی کرنے والا خود اپنے افعال بد سے کھودتا ہے۔

ہمارا تخیل آج کل کے ہندو مذہب کی بہ نسبت عیسائیت سے زیادہ قریب ہے، بعد کے لٹریچر مین جو برہمن اور اپنشد لٹریچر کے نام سے مشہور ہے ہم ایک تبدیلی پاتے ہین، یہان ہم سے کہا جاتا ہو، کہ انسان اپنی جنت اور دوزخ خود بناتا ہے، اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگون کی جنتین دوسرے لوگون کی بہ نسبت بہتر ہون گی، چنانچہ ایسے لوگ بھی ہین جنکی حیات ابدی صرف

ایک سو برس تک قائم رہتی ہے، اور جو پھر غیر فانیون کے ملک مین مرجاتے ہین،

قدیم کتابون سے معلوم ہوتا ہی کہ مرنے کے بعد انسان کے اجزا منتشر ہوجاتے ہین، مثلاً اوسکی گویائی آگ مین آنکھین آفتاب مین، سانس ہوا مین، بال جڑی بوٹیون اور درختون مین خون پانی مین جسم مٹی مین، اور روح فضا مین مل جاتی ہی، زمانۂ قدیم کے ایک مشہور ہندو مفکر جان ولکیا کے ایک ساتھی نے اُس سے دریافت کیا کہ اس انتشار کے بعد خود انسان کا حشر کیا ہوتا ہی؟ اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کے بعد وہ دونون جس نتیجہ پر پہونچے وہ ہمارے لئے کوئی غیر معمولی بات نہین ہی یعنی انسان اپنے افعال کی بنا پر اچھا یا برا ہوجاتا ہی،

یہان یہ امر قابل غور ہے کہ اب انسان کے انجام کے متعلق یہ خیال پیدا ہوگیا، کہ وہ خود اس کے اعمال سے متعین ہوتا ہے اس جنت کا تخیل جس مین پہلے سب لوگ یکسان طور پر چلے جاتے تھے، اب مسترد کردیا گیا، جان ولکیا ہی کے بعض اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہی کہ تناسخ کا مسئلہ ایک متعین شکل اختیار کر رہا تھا، وہ کہتا ہے:- "سونار نقاشی کا ایک کام لیتا ہی، اور اوسکو تراش کر اس سے بہتر کام بنا دیتا ہے، یہی حال اوس شخص کا ہوگا، جو نیک کام کرتا ہی یہان کے بعد وہ بہتر حالت مین ہوگا جس طرح ایک کیڑا ایک پتی کو کھا کر دوسری پتی کا سرا شروع کردیتا ہے اسی طرح انسان ایک ہستی کو ختم کرکے دوسری ہستی کو شروع کردیتا ہی"

تناسخ کا سلسلہ غیر محدود ہے، روح انتقال کرکے جنت مین بھی جاسکتی ہی، اور دوزخ مین بھی یا پھر دنیا مین واپس ہوسکتی ہے، وہ کسی لکڑی یا پتھر مین بھی داخل ہوسکتی ہے نیکی کرنے والے دوبارہ برہمن کے گھر مین جنم لے سکتے ہین، اور برائی کرنے والے ممکن ہی کہ سور کتے یا اچھوت ہوکر پیدا ہون، لیکن اس تمام معاملہ مین حکم صرف انسان کے ذاتی افعال ہی ہین، کوئی دیوتا انسانی اعمال کی جانچ کرکے سزا و جزا نہین دیتا ہر شخص اپنا کرم خود پیدا کرتا ہی، اور کرم مجموعہ ہے اس کے تمام اقوال و اعمال کا، جیسا کسی کا کرم ہوتا ہی، ویسا ہی مرنے کے بعد اس کا انجام ہوتا ہے، جسطرح ہم اپنے آبا و اجداد سے اپنا قد و قامت اپنا رنگ روپ اپنی جسمانی اور مزاجی کیفیت ورثہ مین پاتے ہین، اور اس سے ہمین کوئی چارہ نہین ہوتا، ٹھیک اوسی طرح انسان کی سابق زندگیون کا کرم بھی اوسکی موجودہ زندگی پر اثر انداز ہوتا ہی،

منطقی رو سے کرم کے اس مسئلہ کے معنی یہ ہین کہ روح انسانی ہمیشہ زندگیون کے ایک دائمی سلسلہ سے گذرتی ہی

لیکن رشیون نے اپنے تخیل کی پیدا کی ہوئی بھول بھولیان سے نکلنے کا ایک راستہ معلوم کرلیا "تم حقیقت کو معلوم کروگے، اور حقیقت تم کو آزاد کردے گی"، علم سے کرم کی گرہ کٹ سکتی ہے "یوگ" جو اعمال کے ایک مخصوص طریقہ کا نام ہے اُس کا اصلی کام جسم پر پورا قابو حاصل کرنا، اور مراقبہ کی وہ قوت پیدا کردیتا ہے، جو ایسے آزاد کرنے والے علم کے حصول کا ذریعہ ہو، یہ راز اس مشہور جملہ مین پوشیدہ ہے،- "وہ تو ہی" یعنی روح انسانی اور روح اعلی ایک ہی، جو شخص اس حقیقت کو پالیتا ہی، وہ کرم کی بندش سے آزاد ہوجاتا ہی، اور مختار کل سے واصل ہوجاتا ہی،

ان خیالات سے ہندوستان کا سب سے بڑا فرزند بودھ بھی ضرور واقف ہوگا، بودھ دوبارہ پیدا ہونے اور تناسخ کے مسئلہ کو تسلیم کرتا تھا، لیکن جیسا کہ اوس کے مذہب کے صحیح عقائد سے معلوم ہوتا ہے، اوس نے ان مسائل مین ایک انقلابی تبدیلی پیدا کردی یعنی یہ کہ کوئی روح کوئی انسان دوبارہ پیدا نہ ہوگا، بودھ کے پانچ سو برس پہلے کی ایک مشہور تصنیف مین یونانی بادشاہ منڈانڈر اور راہب ناگ سینا کے سوالات اور جوابات درج ہین، بادشاہ سوال کرتا ہے کہ کیون بعض آدمی زیادہ عمر کے تندرست، خوبصورت، طاقتور، دولتمند بڑے مرتبہ کے، اور عقلمند ہوتے ہین، اور بعض ٹھیک ان کے برخلاف؟ راہب جواب دیتا ہے کہ بعض درختون کے پھل کھٹے ہوتے ہین، بعض کے نمکین بعض کے کڑوے، اور بعض کے میٹھے، اور پھر پوچھتا ہے کہ ایسا کیون ہوتا ہے، بادشاہ جواب دیتا ہے، کہ فرق اُن کے بیجون کے سبب سے ہے، راہب کہتا ہی کہ آدمیون کا بھی یہی حال ہے، وہ سب اپنے اپنے کرم کے وارث ہین، اور یہی اُون کے اختلاف کا سبب ہے، وہ بادشاہ کو بتاتا ہے، کہ دوبارہ پیدا ہونے کا سبب اس دنیا سے وابستگی ہے، اور جب تک یہ وابستگی منقطع نہ ہوجائے گی، ایک پیدائش کے بعد دوسری پیدائش ہوتی رہے گی، ان تمام باتون مین وہ ہندو مذہب کے خیالات سے متفق ہے، لیکن اختلاف اس وقت ظاہر ہوتا ہے، جب بادشاہ متعجب ہوکر یہ سوال کرتا ہے کہ دوبارہ پیدا ہونا ممکن کیونکر ہے، جب تک کوئی شے کوئی روح ایک وجود سے دوسرے وجود تک منتقل نہ ہو، راہب اس دقت کو بھی حل کرتا ہے، وہ کہتا ہے، کہ کیا جب ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن کیا جاتا ہے، تو روشنی منتقل ہوجاتی ہے یا استاد جب کوئی شعر پڑھاتا ہے، تو وہ شعر استاد سے شاگرد کو منتقل ہوجاتا ہے، اسی طرح روح کے انتقال کے

بغیر ایک زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی آتی ہے،

بودھ کے نزدیک انسان ایسا مسافر ہے، جو ایک طویل سفر کو منزل بہ منزل طے کرتا ہے، لیکن ہر نئی منزل کو اس حیثیت کے مطابق شروع کرتا ہے جو اُسنے پچھلی منزلون مین حاصل کرلی ہے، وہ ارواح اور دیوتاؤن کو بھی ایک منزل سے دوسری منزل تک سفر کرنے کی صفت مین انسان کا شریک خیال کرتا ہے، اُسے کبھی اس کا خیال بھی نہین ہوا کہ ایک ہستی کے بعد حیاتِ ابدی حاصل ہو سکتی ہے،

بودھ کے زمانہ کے بعد اس سفر کی آخری منزل کا نام "نروان" رکھ لیا گیا، حالانکہ اس کی حیات مین "نروان" کا مفہوم اپنی ذات سے بُرائی کو نکال دینا تھا، "نروان" ہے کیا؟ اس سوال کا جواب تقریبًا ناممکن ہے، یہ بتانا نسبۃً آسان ہے، کہ "نروان" کیا نہین ہے، "نروان" کا مفہوم تمام وجود ارضی کے مخالف ہے، دنیا اور اوس کی تمام چیزین جو ہمارے تخیل مین آسکتی ہین، اس کے حدود سے باہر ہین، ان سب کی نفی کا نام "نروان" ہے، انگلستان کا باشندہ "نروان" اور فنا کو برابر سمجھتا ہے، اور یہی خیال بودھ مذہب کے بعض پیرون کا بھی ہے، لیکن اس مذہب کی قدیم ترین کتابون مین یہ مفہوم بالکل نہین پایا جاتا، سنیٹ پال بھی کہتا ہے کہ خدا نے اپنے چاہنے والون کے لئے جو چیزین تیار کر رکھی ہین، اون کو نہ تو انسان کی یہ آنکھین دیکھ سکتی ہین نہ کان سن سکتے ہین اور نہ دل سمجھ سکتے ہین، لہذا اس دنیا کی تمام چیزون کی نفی کرنے سے نفیِ مطلق کا پیدا ہونا لازم نہین آتا،

ہندو اور بودھ مذہب اس رکی عقیدہ سے متفق ہین کہ موت صرف ایک منزل کا نام ہے، دونون کے نزدیک نعش کے دفن ہونے یا جلا دیے جانے کے بعد بھی مردہ کا "کرم" برابر چلتا رہتا ہے، یہ دوبارہ کسی انسان یا جانور کی شکل مین رونما ہو سکتا ہے، یہ مرتا نہین، لیکن اگر وہ رشتہ جو اوسکو انسان سے وابستہ رکھتا ہے، منقطع کر دیا جائے، تو یہ رفتہ رفتہ زائل ہو جاتا ہے، اور پھر انسان اپنے کرم سے آزاد ہو جاتا ہے،

کچھ لوگ کہتے ہین کہ زندگی کے متعلق مشرق کا تخیل نہایت یاس آمیز ہے، اس مین شبہہ نہین، یہ تخیل دنیا کے درد و غم کو تھوڑا نہین سمجھتا، لیکن باوجود اس کے انجام کی کامیابی بھی اسکی نظرون سے پوشیدہ نہین ہے، ہندوستان

کو ہمیشہ کثرت مین وحدت کی، مرئی مین غیر مرئی کی، اور مجاز مین حقیقت کی تلاش رہی ہے، اوس نے ہمیشہ دنیاوی خواہشون کی بندش سے آزاد ہو کر انسان کی حقیقی اور دائمی فطرت کے حصول کی کوشش کی ہے، عرصہ سے یہ ملک حوادث زمانہ کا شکار ہے، لیکن جسم کی قید کے باوجود ایک بڑی اور مستقل اُمید نے اوسکی روح کو ہمیشہ آزاد رکھا ہے، مغرب کے تعلق نے ہندوستان کو سب کچھ دیا ہے، لیکن ہم اپنے عہد حاضر کے لئے جو چند روزہ چیزون کے حصول مین اس درجہ منہمک ہے، ہندوستان سے اس حقیقت کی تعلیم حاصل کر سکتے ہین کہ انسان کی اصلی فطرت ربانی ہے، اور اوسکی زندگی عبارت ہے اُس کے موجودہ مقبوضات کی کثرت سے نہین بلکہ ان چیزون کے حصول سے جو مستقل اور دائمی ہین،

جنگ کی مخالفت مین آئنسٹائن کی جدوجہد

صلح کانفرنسون کے تماشہ اور تخفیفِ اسلحہ کے جلسون کی نمائش سے گھبرا کر پروفیسر آئنسٹائن جو دنیائے سائنس کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت ہین ایک ایسی جماعت قائم کرنا چاہتے ہین جس کا نصب العین عامۃ الناس کی فلاح و بہبود اور جنگ و جدال کا استیصال ہو، یہ جماعت تمام قومون کے پچیس منتخب اور اعلیٰ ترین اہلِ دماغ پر مشتمل ہوگی، جن کے انتخاب مین اس امر کا مخصوص طور پر لحاظ رکھا جائیگا کہ اُن کی عظیم الشان شخصیتین بین الاقوامی شہرت بھی رکھتی ہون، اور وہ بھی اپنی آزاد خیالی اور کشادہ دلی کے لئے مشہور ہون، رسالہ لٹریری ڈائجسٹ کے نامہ نگار کا بیان ہے، کہ جب کبھی بنی نوع کے سامنے کوئی اہم مسئلہ آئیگا، یہ کمیٹی اپنی آواز بلند کریگی اور جسوقت امنِ عالم مین رخنہ کا خطرہ پیدا ہوگا، یا بے انصافی برتی جانے لگیگی، اوسکی طرف سے مناسب کارروائی عمل مین لائی جائیگی:-

حال مین پروفیسر آئنسٹائن تخفیفِ اسلحہ کی اس کانفرنس مین گئے تھے، جو جنیوا مین منعقد ہوئی تھی، تھوڑی ہی دیر قیام کرنے کے بعد وہ نہایت کبیدہ خاطر ہو کر وہان سے اوٹھ آئے، نامہ نگار نے "صلح و امن کے اس مسرت انگیز نظر" کے متعلق اُنکے خیالات معلوم کرنے چاہے، پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، "سرور یہ" کے لفظ پر برس پڑے، اور وہ سب کچھ کہہ ڈالا، جسے محسوس تو غرب کے اکثر لوگ کرتے ہون گے، لیکن اس قدر وضاحت اور صفائی کے ساتھ زبان پر لانے کی جرأت اب تک شاید

ہی کسی کو ہوئی ہو۔"

"یہ مسرت انگیز نہین، ایک دردانگیز منظر ہے، اور باوجود تمام تمسخر اور نقالی کے دور جدید کا سب سے بڑا اور دردانگیز سانحہ ہے، کسی کو حق نہین کہ اس کی اہمیت سے بے اعتنائی کرے، اور ہنسنے جب کہ اوسے رونا چاہئے، ہم سب کو مکان کی چھتون پر کھڑے ہو کر پکار کر کہدینا چاہئے کہ یہ کانفرنس محض نقالی ہے، یہ انصاف اور اقوام عالم کی خواہشات کی نقالی ہے یہی نہین کہ صلح کی یہ کانفرنس ناکام ہوئی ہے بلکہ مندوبین صلح کے پردہ مین جنگ کو ترقی دینے کی غرض سے جمع ہوئے ہین، انھون نے قوم سے کہا تھا کہ ہم امن حاصل کرنے کی غرض سے جنیوا جائین گے لیکن یہان آنے کے بعد وہ جنگ کی باتین کر رہے ہین، مین جنیوا اس لئے آیا ہون کہ تمام دنیا کی قومون کو جنگ سے برگشتہ کرنے کی ایک تحریک شروع کرون اور اس کے لئے جو کچھ مجھ سے ممکن ہوا دکھا دکھون، مین ان اقوام کو جنگ کا مخالف بنانا چاہتا ہون جو اپنے اپنے وطن مین مقیم ہین، اور نہ اس کانفرنس مین نہ اس سے قبل کسی اور کانفرنس مین حقیقۃً اون کی نمایندگی ہوئی ہے، جو لوگ یہان موجود ہین اونھون نے اپنے کو کچھ اسطرح گھیر رکھا ہے اور مسلح کر رکھا ہے کہ کسی کے لئے اُن پر اثر ڈالنا ممکن ہی نہین، جو راہ اس کانفرنس نے اختیار کرلی ہے اوس سے آپ مین یا کوئی اور شخص اب اوس کو پھیر نہین سکتا، یہان کی صلح کانفرنس ایک سوانگ ہے، اور ہمیشہ سوانگ ہی رہے گی، یہ وہ چیز نہین جسکے لئے ہم اتنے برسون سے منتظر تھے، جنگ عظیم کے اختتام سے قبل ہم صلح و امن سے جس قدر دور تھے، چودہ[14] برس بعد اب بھی اسی قدر دور ہین ہم نے اس بات کا مدتون تک انتظار کیا کہ سیاست دانون اور مدبرون نے جس چیز کے حاصل کرنے کا وعدہ کیا تھا، اُسے حاصل کرلین یعنی صلح اور دائمی صلح، ہم نے اون کو صلح قائم کرنے اور اسے مستقل بنانے کیلئے یہان بھیجا تھا، انھون نے ہم کو دھوکہ دیا اور بے وقوف بنایا، یورپ اور امریکہ کے کروڑون آدمی، تمام دنیا کے اربون آدمی اور اربون مرد اور عورتین جو ابھی پیدا بھی نہین ہوئی ہین سب کو اس کانفرنس مین دھوکہ دیا گیا ہے اور دھوکہ دیا جا رہا ہے، ہم نے کافی مدت تک انتظار کیا اور ادھورے کامون اور وعدون پر کافی صبر کر چکے، اب زیادہ کی تاب نہین، اب سے قوم اگر خلوص دل سے صلح کی خواہشمند ہے تو اس معاملہ کو خود اپنے ہاتھون مین لے گی، کسی صلح کانفرنس مین حکومتین نہین بلکہ خود قومین اپنے نمایندے بھیجین گی، قوم کے مرد اور عورتین جنگی اسلحون کے بنانے اور استعمال کرنے کے خلاف کارروائی کرین گے، اگر تم امریکہ مین امن چاہتے ہو تو تمہین

چاہئے کہ یورپ مین ہمارا ساتھ دو اور ہم لوگ ملکر کاریگرون سے کہین کہ جنگی اسلحون کے بنانے اور باہر روانہ کرنے سے انکار کردین ہر قسم کی فوجی خدمت سے انکار کردین، اس وقت پھر فوج مین جبری داخلہ ہوگا اور نہ آیندہ کوئی جنگ ہوگی، اگر تمام دنیا کے کاریگر فیصلہ کرلین کہ نہ تو سامان حرب بنائین گے، اور نہ اُسے باہر بھیجین گے تو ہمیشہ کے لئے جنگ کا خاتمہ ہو جائے، ہم کو یہی کرنا چاہئے کہ سامان حرب کے کارخانے جو تمام جنگون کا سرچشمہ ہین، انھی کو خشک کر دینے کیلئے ہمین اپنی زندگی وقف کردینی چاہئے، مجھے صحیح اطلاع ہے کہ آج اگر یورپ کے کسی حصہ مین جنگ چھڑ جائے تو دیانتداری کے ساتھ اس کی مخالفت کرنے والون کی اتنی کثیر تعداد اسلحے پھینک دیگی یا اون کو استعمال کرنے سے انکار کردے گی کہ قبل اس کے کہ دشمن سے مقابلہ کے لئے آگے بڑھے، ہر فوج کے نصف حصہ کو دوسرے نصف کی بغاوت فرو کرنے مین مصروف ہوجانا پڑیگا، یہان کے نمایندون اور وہ لوگ جو قومون پر حکومت کرتے ہین، اُنمین سے اکثرون کو علم ہی نہین کہ ان کی قوم کا خیال کیا ہے یا جنگ کے متعلق وہ کیا رائے رکھتی ہے .... مجھے یقین ہے کہ اگر قومون کو اُن کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک دوسرے سے نفرت نہ کرین گی، اگر اُنھین ایک دوسرے سے نفرت کرنے پر اُبھارا نہ جائے تو وہ دوستانہ طریقہ پر مل کر رہین گی، خصوصاً اب جب کہ سائنس اور معلومات نے اکثر بیماریون کو دور کر دیا ہے، اور ہر شخص کے لئے آسودگی، مسرت اور تندرستی کی زندگی ممکن کردی ہے، موجودہ زمانہ کو تو دنیا کے لئے جنت کا زمانہ ہونا چاہئے، بنی نوع انسان کو مسرت کے جو امکانات اس وقت حاصل ہین، وہ اس سے قبل کبھی میسر نہ تھے،

"ع ز"

انقلاب الامم

ڈاکٹر لیبان کی مشہور کتاب قومون کی ترقی و تنزل کے قوانین نفسی کا خلاصہ جسکو پڑھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا مین قومین کیونکر بنتی اور بگڑتی ہین طبع دوم قیمت ۱۲؍ ضخامت ۱۶۲ صفحے

"منیجر"

اخبار علمیہ

آسٹریلیا کے ہوائی شفاخانے

آسٹریلیا کے اندرونی حصہ مین (۲۵۰۰۰) مربع میل کے رقبہ مین چند سالون سے طبی امداد ہوائی جہازون کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے، اس براعظم کا اندرونی حصہ بہت کم آباد ہے اور ایک بستی دوسری بستی سے بہت دور واقع ہے، ڈاکٹر ڈاکرانزن کی ایک تقریر سے جس کا خلاصہ برٹش میڈیکل جرنل کے حوالہ سے رسالہ لٹریری ڈائجسٹ نے شائع کیا ہے معلوم ہوا کہ ان دور دراز آبادیون مین پہلے تیرہ شفاخانے قائم کردئے گئے تھے، لیکن آبادیان منتشر اور ایک دوسرے سے اس قدر فاصلہ پر واقع تھین کہ ان شفاخانون سے طبی امداد کی ضرورت پوری نہ ہوسکی، لاسلکی، اور طیارون کی ایجاد کے بعد اس کمی کی بہت کچھ تلافی ہوگئی، اور ۱۹۲۸ء مین مغربی کوئنس لینڈ (آسٹریلیا) مین دنیا کا سب سے پہلا ہوائی شفاخانہ قائم کیا گیا، یعنی طیارون کے ذریعے دور دراز مقامات پر طبی امداد پہنچانے کا انتظام کیا گیا، جو مکانات زیادہ دور پر واقع تھے، ان مین لاسلکی کے مرسل (TRANSMITTERS) جن سے (۳۰۰) میل تک آواز پہونچ سکتی تھی، لگا دیے گئے، "ہوائی ڈاکٹر" ان مقامات کا دورہ کرتا رہتا ہے، اور جس مقام پر فوراً خود نہین پہنچ سکتا، وہان لاسلکی کے ٹیلیفون کے ذریعہ سے مشورے دیتا ہے، اس محکمہ کے قیام کے پہلے سال مین ڈاکٹر سینٹ ونسنٹ ویلش نے بیس ہزار میل کا ہوائی سفر کیا، (۲۵۵) مریض دیکھے، اور (۲۶) مختلف مرکزون پر (۴۲) مشورون مین شرکت کی، جس رقبہ مین یہ ہوائی طبی محکمہ قائم ہے، اوسکی وسعت جرمنی، آسٹریلیا، سوئزرلینڈ، اور ڈنمارک کی مجموعی وسعت سے زیادہ ہے اس محکمہ کے قیام مین ہر طبقہ کے آدمیون نے شرکت کی ہے، اس مین سرکاری امداد بھی شامل ہے اور غیر سرکاری عطیے بھی طیارہ مین پائلٹ کے علاوہ ڈاکٹر، نرس، مریض، اور اوسکے ایک عزیز کی جگہ ہوتی ہے، اسوقت چار ہوائی ڈاکٹر خدمت انجام دیرہے ہین،

ناخن اور صحت

ناخن دیکھ کر کسی شخص کی صحت کا اندازہ کرلینا کوئی جدید تحقیق نہین، اس علم سے متقدمین بھی واقف تھے، لیکن حال مین پھر از سر نو تحقیق کی گئی ہے، اور یورپ کے تین مشہور ڈاکٹرون (ZEOLLER, NOYER, BUIDE) نے بارہ سو آدمیون پر تجربہ کرکے اس طریق تشخیص کو ایک باقاعدہ فن بنا دیا ہے، اُن کے تجربات کا خلاصہ لٹریری ڈائجسٹ کے حوالہ سے حسب ذیل ہے:

جن بارہ سو اشخاص کا معائنہ کیا گیا، اُن مین بیمار، نقیع اور تندرست ہر طرح کے لوگ شامل تھے، تندرست اور قوی آدمیون کے ہاتھ کی انگلیون کے ناخن کی جڑ مین چھوٹے چھوٹے سفید ہلال ہوتے ہین، ایسا ایک ایک ہلال ان کے اکثر ناخنون کی جڑ مین پایا جاتا ہے، جو لوگ کسی متعدد مرض کا شکار ہوتے ہین ان کے صرف انگوٹھون کے ناخنون مین ایسے ہلال ہوتے ہین لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے لوگون کے انگوٹھون پر بھی کوئی "ہلال" نہین ہوتا، اگر کوئی شخص کسی متعدد مرض مین مبتلا ہوجائے تو مرض کے دور ہوجانے کے بعد لیکن کامل صحت سے قبل ہی ایسے "ہلال" اُس کے ناخنون پر ظاہر ہوسکتے ہین، جن لوگون کی صحت عام طور سے اچھی رہتی ہے، اُن کے ناخنون پر یہ چھوٹے چھوٹے "ہلال" قوت کی زیادتی اور کمی کے اعتبار سے بڑھتے گھٹتے رہتے ہین، موسم کے اختلاف سے بھی اُن مین تبدیلیان ہوتی رہتی ہین، موسم بہار مین یہ چھوٹے چھوٹے ہلال کچھ بڑھ جاتے ہین، اور خزان مین پھر گھٹ جاتے ہین، یہ ممکن ہے کہ جس شخص کے ہر ناخن کی جڑ مین ایسا ہلال موجود ہو، وہ بھی کسی متعدی مرض مین مبتلا ہوجائے، تاہم جن لوگون کی صحت عموماً اچھی رہتی ہے، اگر اون کے ناخنون سے یہ ہلال غائب ہوجائین، تو اونھین چاہیے کہ اوس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرین،

ایک کوفی کتبہ

جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن، جنوری ۱۹۳۳ء) نے ایک قدیم کوفی کتبہ کا فوٹو شائع کیا ہے جسے مسٹر جرالڈ رائٹ لیگر نے ۱۹۳۱ء مین کوفہ مین خریدا تھا، اس کتبہ پر کوئی تاریخ درج نہین ہے، لیکن اس کا خط قدیم کوفی

خط کا نمونہ ہے، کتبہ کی تختی کچی مٹی کی بنی ہے، اور کسی سانچہ مین ڈھلی معلوم ہوتی ہے، مٹی بے حد نازک ہے، اور ہاتھ لگتے ہی ٹوٹ جاتی ہے، حیرت یہ ہے کہ باوجود اس قدر نازک اور بوسیدہ ہونے کے اس کی عبارت اب تک محفوظ ہے، اس تختی پر سورۂ یٰسین کی آخری ۱۴ آیتین لکھی ہوئی ہین، قاہرہ کے مختلف لوح مزار اور خلیفہ مہدی (۱۵۵ ہجری) کے کتبہ کا مقابلہ اس کتبہ سے کرنے کے بعد موسیو فلوری کی رائے ہے کہ یہ کتبہ دوسری صدی ہجری کے نصف آخر یا تیسری صدی کے نصف اول کا ہے،

الوافی بالوفیات

صلاح الدین خلیل ابن ایبک الصفدی کی مشہور تالیف "الوافی بالوفیات" یعنی مشاہیر اسلام کی سوانح عمریون کا ضخیم مجموعہ جو تقریباً ۳۰ جلدون پر مشتمل ہے، اس وقت تک صرف اس وجہ سے شائع نہ ہو سکا تھا کہ یورپ کے کتبخانون مین اس کی چند ہی جلدین موجود تھین، اور مصر و قسطنطنیہ مین بھی کوئی مکمل نسخہ موجود نہ تھا، مقام مسرت ہے کہ پروفیسر رٹر (PROF. RITTER) نے اس کے تمام قلمی نسخون کا پتہ لگا کر جو مختلف کتبخانون مین منتشر تھے اسکی اشاعت کا تہیہ کر لیا ہے، اور اوسکی پہلی جلد شایع بھی کر دی ہے، جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن جنوری ۱۹۳۳ء) مین ڈاکٹر کرنکاؤ نے اس پر ایک ریویو لکھا ہے، ان قلمی نسخون مین سے بعض خود صلاح الدین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہین، اور بعض اوس کے اصل مسودون سے نقل کئے گئے ہین،

گبن کا کتبخانہ

جنیوا کے ایک کتب فروش کے پاس مشہور انگریز مورخ اڈورڈ گبن کے کتبخانہ کی تقریباً دو ہزار جلدین پائی گئی ہین، یہ کتابین نہایت محفوظ حالت مین ملی ہین، اور ان سب پر گبن کی مہر ثبت ہے، یہ اُس مجموعہ کا بڑا حصہ ہے، جسے گبن نے اپنی تصنیفات کی بنیاد اور سفر و حضر مین اپنی زندگی کی بہترین آسایش قرار دیا تھا، اوسکی زندگی کا بیشتر حصہ لوزان (سوئزرلینڈ) مین صرف ہوا، جہان اوس نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "زوال سلطنت روما" کی آخری تین جلدین لکھی تھین، قیاس یہ ہے کہ اُس کا کتبخانہ اس کی وفات (۱۷۹۴ء) کے بعد سوئزرلینڈ ہی مین رہ گیا، خبر ہے، کہ مڈالن کالج آکسفرڈ کی طرف سے جہان گبن نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی تھی، ان کتابون کے لئے تین ہزار پونڈ پیش کئے گئے ہین، لیکن کتب فروش کی جانب سے چار ہزار پونڈ کا مطالبہ ہے،

عرب نوآبادی

جنوبی افریقہ کے صوبہ رودیسیا مین نہر زمبز کے قریب ایک عرب کی قبر دریافت ہوئی ہے، جو تقریباً بارہ صدی پہلے کی ہوگی، قبر پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے، :-

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، یہ قبر سلام بن صالح کی ہے جس نے ۱۰۵ھ مین دار دنیا سے دار آخرت کی طرف انتقال کیا،"

ڈاکٹر اشٹانلی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نوآبادی قائم کرنے والے عرب ان مقامات پر جنوبی افریقہ کی طرف سے پہنچے، اور اُن لوگون نے سونے کی اُن کانون سے فائدہ اوٹھایا جن سے اُن کے اسلاف یمنی عربون نے بہت پہلے فائدہ اٹھایا تھا، ڈاکٹر موصوف نے اُن مقامات کی دوسری عرب یادگارون سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عربون نے اُن شہرون مین پرتگالیون کے پہنچنے سے بہت پہلے اپنی نوآبادی قائم کر لی تھی،

امریکہ اور چین کا قدیم تعلق

ڈاکٹر میریس باربو (کناڈا) کا خیال ہے کہ امریکہ کے قدیم باشندے جو انڈین کہے جاتے ہین اصل مین منگول نسل کے ہین جو ایشیا سے شمالی امریکہ مین منتقل ہو آئے تھے، اس خیال کی بنا یہ ہے کہ ان لوگون مین جو گیت رائج ہین، وہ چین کے موجودہ گیتون سے بہت ملتے جلتے ہین، اور یورپ یا دنیا کے کسی اور حصہ کے گیت سے نہین ملتے، امریکن انڈین لوگون کے بعض گاؤن مین کچھ چینی اصل کے الفاظ اور فقرے بھی دریافت کئے گئے ہین، یہ لوگ ان الفاظ اور فقرون کے معنی بھول چکے ہین اور محض عادۃً اپنے گیتون مین انھین دہراتے رہتے ہین، ڈاکٹر باربو نے اپنی تحقیق مین یہ بات بھی معلوم کی ہے کہ چینی اور امریکن انڈین گیتون کی یہ مشابہت امریکہ کے شمالی مغربی حصہ مین ساحلی فرقون مین خصوصیت کے ساتھ نمایان ہے، اس غیر معمولی مشابہت کی بنا پر ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ یہ فرقے حال ہی مین ایشیا سے آکر آباد ہوئے ہین اور غالباً چنگیز خان کے زمانے مین آئے ہین،

"ع ز"

ادبیات

خونِ جگر

از

حضرت جگر، مرادآبادی،

نظر سے حسن، دو عالم گرا دیا تو نے، نہ جانے کون سا عالم دکھا دیا تو نے،

جوابِ حسنِ طلب، اور کیا دیا تو نے تمام شکر و شکایت بنا دیا تو نے

فنائے عشق کو رنگِ بقا دیا تو نے حیات و موت کو یکجا دکھا دیا تو نے

ہزار جانِ گرامی فدا این نسبت کہ میری ذات سے اپنا پتا دیا تو نے

یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لامحدود مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تو نے

جمالِ حسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے

ہزار دل کو مٹا کر دیا مجھے اک درد اُس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تو نے

خوشا وہ دردِ محبت، زہے وہ دل کہ جسے ذرا سکون ہوا گد گدا دیا تو نے،

نگاہ ڈال کے میری تمام ہستی پر، مجھے تمام محبت بنا دیا تو نے؛

ہر ایک دل کو عطا کر کے مدعائے حیات

جگر کو اک دلِ بے مدعا دیا تو نے؛

تابشِ سہیل

از

از جناب اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے، ال ال بی علیگ اعظم گڈہ،

زبانوں پر نہیں اب طور کا افسانہ برسوں سے تجلی گاہ ایمن ہے دلِ دیوانہ برسوں سے

کچھ ایسا ہے فریبِ نرگسِ مستانہ برسوں سے کہ سب بھولے ہوئے ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

وہ چشمِ فتنہ گر ہے، ساقیِ میخانہ برسوں سے کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

نہ اب منصور باقی ہے نہ وہ دار و رسن لیکن فضا میں گونجتا ہے نعرۂ مستانہ برسوں سے

چمن کے نونہال اس خاک میں پھولیں پھلیں کیونکر یہاں چھایا ہوا ہے سبزۂ بیگانہ برسوں سے

وداع اے پاسِ تمکین، رخصت اے آئینِ خودداری جنوں بھولا ہوا ہے لغزشِ مستانہ برسوں سے

یہ آنکھیں مدتوں سے خوگرِ برقِ تجلی ہیں تو نشیمن بجلیوں کا ہے مرا کاشانہ برسوں سے

ستم کا اہتمامِ دلفریبی اب نہیں باقی وہ زلفیں ہو رہی ہیں بے نیازِ شانہ برسوں سے

نہیں اب وہ نگاہِ شرمگیں کے وار چھپ چھپ کے کہ اب ناوک زنی ہوتی ہے بیباکانہ برسوں سے

حرم والوں میں شایانِ کرم شاید نہیں کوئی کہ برقِ امتحاں لرزاں ہے بیتابانہ برسوں سے

کوئی شوریدہ سر باقی نہیں کیا اہلِ تقویٰ میں کہ ہے بیما طلب سنگِ درِ جانانہ برسوں سے

ترے قرباں ادھر بھی ایک جھونکا ابرِ رحمت کا جبینوں میں گرہ ہے سجدۂ شکرانہ برسوں سے

دکھا دے ایک جلوہ پھر اسی شانِ جمالی کا نگاہیں منتظر ہیں جس کی مشتاقانہ برسوں سے؛

سہیل اب کس کو سجدہ کیجیے حیرت کا عالم ہے،

جبیں خود بن گئی سنگِ درِ جانانہ برسوں سے،

"رنگِ حسرت"

از جناب جمیل قدوائی بی اے

اُون کو مجھ سے جواب حجاب نہیں،
دل کو بھی اب وہ اضطراب نہیں،

ہے اُنہیں مجھ پہ اعتماد وفا
اب وہ اگلا سا اجتناب نہیں،

بحث کر لطفِ وصل کتے ہیں،
پھر کہوگے کہ کامیاب نہیں؟"

اس قدر ہیں وہ مہربان مجھ پر،
اُن کے الطاف کا حساب نہیں،

کامیابِ وصالِ جانان ہون،
پھر بھی کتے ہیں "کامیاب نہیں،

مین تو سیراب عیشِ وصل کرون
کیا کرون تجھ مین اس کی تاب نہیں"،

مین یہ کیون کر کہون کہ حسبِ مراد
دل پر شوق کامیاب نہیں،

آپ سے چھٹ کے رہ نہیں سکتا
بخدا اتنی دل کو تاب نہیں،

اب بھی ہون بیقرارِ لطف وکرم
ہان وہ اگلا سا اضطراب نہیں،

آپ کے رحم کی ضرورت ہو،
حالِ دل اس قدر خراب نہیں،

وہ نظر لاکھ بے حجاب سہی،
شوقِ گستاخ کا جواب نہیں،

آج دنیاے دلبری مین کہین
آپ کے حسن کا جواب نہیں،

رخِ جانان مین اب بھی ہے اک بات
گو وہ پہلی سی آب وتاب نہیں،

آپ کے چشم مست کے آگے،
اثرِ ہستی شراب نہیں،

آپ کے حسن کے مقابل مین
کوئی شے سُرخیِ گلاب نہیں،

سچ تو یہ ہے جمالِ جانان کا
ایک پرتو ہے آفتاب نہیں،

آج تیرے سوا جمیل کوئی،
رنگِ حسرت مین کامیاب نہیں،

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ مُبارک شاہی

مصححہ شمس العلما مولوی ہدایت حسین صاحب شائع کردہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱ پارک اسٹریٹ کلکتہ ضخامت صفحے

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے ہندوستان کی اسلامی تاریخون کے چھاپنے اور شائع کرنے کی جو قیمتی کوششین کی ہین، وہ پورے ملک کے شکریہ کی مستحق ہین، اسی طرح سوسائٹی کے موجودہ عہد مین شمس العلما مولوی ہدایت حسین صاحب نے اس قسم کی مفید کتابون کی تصحیح وتحشیہ مین جو مفید خدمات انجام دئے ہین وہ بھی ہم سب کے اعتراف کے لائق ہین،

چنانچہ اس سلسلہ کی اخیر کڑی تاریخ مبارک شاہی ہمارے سامنے ہے،

ہمین کوئی شک نہین کہ ہندوستان کی سیاسی اسلامی تاریخ مین سید بادشاہون کی حکومت کا دور جو ۸۱۷ھ سے شروع ہو کر ۸۵۵ھ پر تمام ہوتا ہے، بیحد تاریکی مین ہے، اور اب تک اس دور کے متعلق کوئی اطلاع اولین ہمارے پاس موجود نہ تھی اس لئے اس تاریخ مبارک شاہی کی اشاعت جس کا تعلق اسی دور سے ہے، ہمارے لئے بہت کچھ سودمند ہے،

مصنف کا نام یحییٰ بن احمد بن عبد اللہ ہے، سہرند کا رہنے والا ہے، اس لئے وہ اپنے کو سہرندی کہتا ہے، مبارکشاہ کی تخت نشینی کے بعد جو ۸۲۴ھ مین ہوئی تھی، یہ کتاب تالیف کی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مبارکشاہ ہی کے زمانہ مین ۸۳۸ھ مین اس نے ختم کی، چنانچہ اس ۸۳۱ھ کے تحت مین (ص ۲۱۱) بادشاہ عصر کی دعاے حیات وقیام کے بعد لکھا ہے۔

"این دعاگوی ہی خواست کہ بر سمِ اصحاب انشا، وارباب املا سخنی چند در اختتام این کتاب گوید وختم ہم در دعای شاہ عالم پناہ کند، فاما چون ہنوز از بستان سلطانی وگلستان جوانی ایک گل از ہزار شگفتہ است...... بضرورت ناتمام

بگذاشت و بر خود التزام نمود کہ فتوحات شوکت آیندہ و قصۂ ارادت دولت پایندۂ اگر داعی راحیات فا کند ہر سال باینا سہ رتا

و درین صحیفہ ثبت گرداند، انشاء اللہ تعالیٰ وہو الموفق للاتمام والمیسر للاختتام"

مصنف نے اس کے بعد حسب وعدہ باقی شعبان ۸۳۲ھ سے ربیع الآخر ۸۳۸ھ تک مبارکشاہ کی وفات (۸۳۷ھ) اور

پھر محمد شاہ بن فرید شاہ کی تخت نشینی اور بعد ازین ایک سال تک کے واقعات ربیع الآخر ۸۳۸ھ تک، ہمین موجود ہے، اور اخیر مین خاتمہ کی

کوئی تمہید نہین ہے جس سے گمان ہوتا ہے، کہ مصنف کی وفات پر یہ کتاب یون ہی ختم ہو گئی ہے، اور اس سے قیاس کیا جاسکتا

کہ یہی (ربیع الآخر ۸۳۸ھ) مصنف کی تاریخ وفات ہو، کتاب کا آغاز محمد بن سام غوری کے حالات سے ۵۹۹ھ سے کیا ہے، اور اوسکے بعد

سلاطین تغلق تک اختصار کے ساتھ سب بادشاہون کے سوانح لکھے ہین، بعد ازین سید خاندان کے بانی خضر خان بن سلیمان خان کے

کے واقعات ۸۰۱ھ سے کسی قدر مفصل لکھنے شروع کئے ہین، خضر خان کے بعد مبارکشاہ اور پھر محمد شاہ کے ایک سال کے حالات پر کتاب کا خاتمہ ہوگیا ہے،

خیال تھا کہ اس کتاب سے اس خاندان کے انتساب سیادت کی تحقیق مین مدد ملے گی، مگر اس معاصر تاریخ مین بھی

سید جلال بخاری کے مشہور قول "این سیدزادہ است" کے سوا، اور اس شہادت کے سوا کوئی اور مذکور نہین ہے، کہ بادشاہ مین حلم و

عفو و نرمی و درگذر کے جو اوصاف ہین، وہ اوسکی سیادت کی دلیل نہین،

اس کتاب کا نسخہ سب سے پہلے سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے سابق رفیق دار المصنفین و حال پروفیسر اسمٰعیل

کالج بمبئی کے ذریعہ مصحح کو ملا، جو کسیقدر ناقص تھا، پھر بعد کو برٹش میوزیم اور بوڈلین لائبریری سے دو اور نسخے ملے، جنکے مقابلہ سے یہ نسخہ تیار ہوا ہے،

اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی مانہ کا اُنھون نے سلطنت کے کاروبار اور سیاسیات مین دخل دینا شروع کر دیا تھا، اور تعجب ہوتا ہے

کہ قلم کیساتھ تلوار بھی اون کے ہاتھون مین نظر آتی ہے مصحح نے کتاب کے مختلف نسخون کی تصحیح و مقابلہ کے علاوہ کتاب مین جا بجا

حواشی بھی لکھے ہین، اور آخر مین مضامین کی فہرست کے بعد اشخاص کی اور پھر مقامات کی دو اور فہرستین بنا کر شامل کتاب کی ہین،

کتاب گو واقعات کے لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہین رکھتی، مگر اپنے دور کی تنہا ماخذ ہونے کے سبب سے قابلِ قدر ہے چنانچہ پچھلے مورخین مین

فرشتہ اور ملا بدایونی اور نظام الدین وغیرہ نے اسکے حوالے دئے ہین، اور اس سے واقعات نقل کئے ہین، بہر حال اس کتاب کی اشاعت سے اس دور

کی تاریخ کے اصل ماخذ تک ہماری رسائی ہو گئی، اور اس کیلئے ہم مصحح کے خدمات کا دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہین، "س"

مطبوعات جدیدہ

ریاست، از افلاطون مترجمہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی، حجم ۷۴۰ صفحے شایع کردہ

انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن، قیمت،

افلاطون کی کتاب ریاست جو ابتک اردو مین جمہوریت افلاطون کے نام سے موسوم تھی، علم سیاست کی کلاسیکل

کتابون مین ہے، اس کے مختصر خلاصے اور اس سے مستفاد مضامین ابتک اردو رسالون مین چھپتے رہتے تھے، مسرت ہے کہ اب

اس کا مکمل و مستند ترجمہ شایع کیا گیا، اور ترجمہ کے لئے ایسے شخص کو منتخب کیا گیا، جو فلسفہ و سیاست دونون مین صاحب نظر ہے

ترجمہ ذاتی دلچسپی اور طبعی ذوق سے کیا گیا ہے، اس لئے ترجمہ کی روانی، سلاست، اور انداز بیان کی شگفتگی سے پڑھنے مین افسانہ

کا لطف آتا ہے، خصوصًا اس لئے کہ کتاب علمی سوال و جواب کے رنگ مین ہونے کے بجائے، ہنستے بولتے مجمع اور مجلسی اشخاص کے

مکالمہ کے طرز مین ہے، مترجم نے ابتدا مین ایک مقدمہ لکھا ہے جسمین افلاطون کے سرسری حالات زندگی، اور اس کے فلسفہ

اور اس کتاب کے مباحث کو روشناس کیا ہے، اور افلاطون کے بعض نظریون کے متعلق دورحاضر مین جن غلط فہمیون کے پیدا ہونے

کا امکان ہے، اون کو دور کیا ہے،

ریڈیو، از جناب منہاج الدین، ایم ایس سی پروفیسر علوم طبعیات اسلامیہ کالج پشاور، کاغذ چکنا ولایتی حجم ۲۸۰ صفحے

قیمت خوبصورت سنہری جلد ۱۲ مصنف سے مل سکتی ہے،

پروفیسر منہاج الدین اون لوگون مین ہین، جو سائنٹفک مباحث و معلومات کو اردو مین منتقل کرنے کی خدمت مستقل

طور پر انجام دے رہے ہین، اون کی آخری زیر نظر تالیف "ریڈیو" یعنی بے تار پیام رسانی ہے جس مین علم برق کے ابتدائی معلومات

دیگران کا تعلق لاسلکی سے دکھایا ہی، پھر لاسلکی کی ایجاد اور اسکی تدریجی ترقی بیان کی ہے، ریڈیو کے امواج کی ترکیب اور ان کے اثرات و نتائج پیش کیے ہین، لاسلکی کی نشرگاہین اب ہندوستان مین بھی بکثرت رواج پا رہی ہین، اس لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جائیگا، لیکن کتاب کی فنی حیثیت نمایان ہی، اسلئے اصطلاحات زیادہ ہین،

سیرت محمد علی:۔ مرتبہ مولوی رئیس احمد صاحب جعفری ندوی، شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، حجم ۷۴۴ صفحے، قیمت:۔ سے ر

مولینا محمد علی مرحوم کے سانحہ وفات پر اون کی یادگار کے قیام کا مسئلہ ملک مین اوسی زور و شور سے اٹھا تھا جیسے دوسرے اکابر کی وفات پر یہ تحریک اُٹھتی رہی تھی، بالآخر مولانائے مرحوم کی ایک ایسی مفصل سیرت کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا، جو صرف سیرت محمد علی ہو، بلکہ دور حاضر کے پچیس برسون کے ہندوستان کے اسلامیات و قومیات کی مفصل سرگذشت ہو، لیکن جب اس مین بھی تعویق ہوئی تو مولینا عبدالماجد صاحب دریابادی کی تحریک سے مکتبہ جامعہ ملیہ نے زیر نظر کتاب شائع کی جس مین کم و بیش اون ابواب کو روشناس کرنے کی کوشش کیگئی ہی، جن پر مفصل سیرت کی ترتیب کا خیال ہے، شروع مین مولینا عبدالماجد صاحب دریابادی کا ایک پراثر دیباچہ بھی ہی، اسکے مؤلف کی بڑی خوبی یہی ہے کہ کم سے کم فرصت مین زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرکے اون کو دلچسپ اسلوب مین مرتب کر دیا ہے، ضرورت ہے کہ اہل ذوق اوسکی خریداری و اشاعت مین پوری کوشش کرین تاکہ اپنے ایک ہردلعزیز قائد کی سیرت کے پڑھنے کے علاوہ ایک قومی درسگاہ کی اعانت کا فائدہ بھی پہنچے،

علم کلام مرزا، مولفہ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب، امرتسری، حجم بہ ترتیب ۸۰ و ۱۴۴ صفحے قیمت بہ ترتیب

عجائبات مرزا، ۸ر و ۲ر، پتہ دفتر اہلحدیث امرتسر،

مولینا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب مذہبی مناظرہ مین مرزا صاحب کی زندگی مین اون کے حریف و مقابل تھے اور اتبک " مناظرانہ مذہبی رنگ کے بکثرت رسالے احمدیت پر لکھ چکے ہین، لیکن زیر تبصرہ رسالے مذہبی مناظرہ کے بجائے علمی بحث و تحیص کے نقطۂ نظر سے لکھے ہین، جنمین بقول مصنف یہ دکھانا مقصود ہے کہ "مرزا صاحب کی تصانیف کس صنعت سے ہین"، اور اسی لحاظ سے تصنیفات پر نظر ڈالی ہے، مصنف رسالہ اگر برا نہ مانین تو جیسا کہ خود انھین اقرار ہے اون کی یہ کتاب کامل اور استقصائے تام

پر مبنی نہین، اس پر تو اچھی خاصی بڑی کتاب تیار ہوسکتی ہی، شاید مصنف کو قلت فرصت کا عذر ہو،

مرزا صاحب کی تصنیفات پر اگر بامعان نظر ڈالی جائے تو مثلاً ذیل کے امور کا بخوبی اندازہ ہو کہ وہ بسیار نویس تھے اور اپنی تحریرون مین بڑے بڑے اصول بنانے کے خوگر تھے، اون کے وہ اصول محض وقتی و ہنگامی ہوتے، جب کسی دوسرے مدعا کے اثبات کا وقت آتا وہ فراموش ہوجاتے، نئے اصول مدون ہوتے جو ممکن تھا پہلے اصولون کے برعکس ہون، اس لئے مرزا صاحب کی تصنیفات کا بڑا حصہ محض شاعرانہ، بلکہ ذاتی مفروضات فرضی دلائل، اور کہین لفظی تخلیع محکبت پر مبنی ہے، اس کا بہترین نمونہ براہین احمدیہ ہے، اسی طرح نظر آتا ہی کہ وہ غیر محتاط حوالون کے دینے مین جری تھے، اگر محض اسی موضوع پر کوئی مستقل کتاب لکھی جائے تو بیحد دلچسپ ہو، ہان ایک طریقہ استدلال ایسا ہے جسکو مرزا صاحب نے استعمال کیا کہ اسلام اس لئے بہتر مذہب ہے کہ اون جیسا شخص اس مین پیدا ہوا، وہ فلان پیشینگوئی کرتے ہین، جو صدق و کذب کی نشانی ہوگی، پھر یہ کہ وہ پیشینگوئی صحیح ہوئی یا غلط اس پر مباحث اور سوال و جواب کا ایک سلسلہ چلتا،

مرزا صاحب کے دعاوی اور تاویلات اون کی مہدویت اور ذاتی مسیحیت کو چھوڑ کر اون کے دو معاصرین سرسید احمد اور مولوی محمد احسن صاحب امروہوی مصنف تفسیر شاہی سے حرف حرف ماخوذ ہین، اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ کے مضامین بھی کہین کہین بے اظہار نام لے لئے گئے ہین لیکن اگرچہ مرزا صاحب نے سرسید کے خیالات کو اپنے نام سے پیش کیا، تاہم دونون مین کچھ فرق رہ جاتا ہی، سرسید اپنے جانتے اپنے خیالات پر دلائل عقلی کرین لگاتے ہین، اور مرزا صاحب اونھی باتون کو لفظی صناعیون اور خود ساختہ اصولون سے پیش کرنا چاہتے ہین، کہ وہ عقلی دلائل اون کے نفس مدعا کے خلاف پڑتے ہین، ایک اور فرق ان دونون مین یہ ہے کہ سرسید مہدی کے منکر تھے، اور احادیث مہدی کو جعلی مانتے تھے، اور مرزا صاحب اون کو حرف حرف صحیح مان کر اپنے کو ان سب کا مورد بتاتے تھے،

عیسائیون کے رد مین ہمارے علمائے اسلام نے ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے پس و پیش جو کارنامے انجام دئے، افسوس ہے کہ پروپگینڈے کے ذریعہ وہ فراموش ہوتے جارہے ہین، اور اون کی ناشکری ہورہی ہے، ڈاکٹر وزیرالدین صاحب مولانا رحمت اللہ صاحب، سرسید، مولوی چراغ علی اور مولینا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہم نے اسوقت جو کارنامے انجام دئے، و

مرزا صاحب بدرجہا بہتر ہین، اسی طرح آریون کے مقابلہ مین خاص بانی آریہ سماج دیانند سوامی کے رد مین مولانا قاسم صاحب بانی مدرسۂ دیوبند نے جو کام کیا، اس کا اعتراف نہ کرنا کفران محسن ہی،

ہان مرزا صاحب نے ان بزرگون سے جس بات مین سبقت کی وہ مخالفین کے طرز اسلوب اور حیا کی زبان کا کر بلکہ جواب دینا ہے، مثلاً عیسائی نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کو سخت سست الفاظ مین یاد کرتے تھے، مسلمان مجیب اون کے جواب مین حضرت عیسیٰ پر حرف نہین رکھتے، مرزا صاحب نے اس بزرگی کی احتیاط نہین کی، اور اسی قسم کے الفاظ مین یسوع کو یاد کیا اور اسمین اون پر بھی بازی لے گئے، اسی طرح مثلاً سنی مناظر شیعون کے جواب مین حضرت علی مرتضیٰ یا حسنین رضی اللہ عنہم کی توہین نہ کر سکتے تھے، مرزا صاحب نے اس مین بھی ترکی بترکی اصول ملحوظ رکھا، یہ وہ چند اشارات ہین، جو غیر فرقہ آرایانہ طور پر محض علمی حیثیت سے پیش ہوئے اور جن کے مباحث اسی نقطۂ نظر سے اس موضوع کی کتاب مین تفصیل سے دکھائے جا سکتے ہین،

دیوان گرامی (فارسی) یعنی مجموعۂ کلام ملک الشعراء شیخ غلام قادر گرامی ناشر شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لاہوری دروازہ، لاہور، حجم ۲۱۶ صفحے قیمت:- عہ

فارسی ادب کے ارباب ذوق کو حضرت گرامی کے دیوان کی اشاعت کا انتظار تھا، مسرت ہے کہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لاہور نے یہ خدمت انجام دی، یہ مجموعہ غزلیات، مثنویون اور مناقب و قصائد و قطعات سب پر مشتمل ہی، مثنویون اور قطعون پر تعلیقات یعنی حواشی بعض فارسی اور بعض اردو مین درج ہین، جنہین بعض خود گرامی کے قلم کے معلوم ہوتے ہین، کوئی دیباچہ یا مقدمہ شامل نہین، اگر گرامی کا مختصر تعارف کرا دیا ہوتا تو مناسب ہوتا، ورنہ کم از کم ڈاکٹر سر اقبال کی وہ تحریر شامل کر دی جاتی جو انھون نے گرامی کی وفات پر اخبار انقلاب مین شائع کرائی تھی،

یازدہ سورہ شریف: ناشر جناب ماسٹر محمد احسان ہیکوارٹ پریس لاہور، جیبی تقطیع کے ۱۲۰ صفحے قیمت:- عہ

یہ ایک خوشنما پاکیزہ خط رنگین و منقش سرورق، طلاکار جلد اور نفیس کاغذ پر رنگین اور منقش حواشی سے چھپا ہوا مختصر مجلد مجموعہ ہے، جس مین قرآن مجید کی گیارہ سورتین اور چند اوراد و وظائف جمع کئے گئے ہین، ہر صفحہ کے سامنے دوسرے صفحہ پر آیات واوراد کا اردو ترجمہ بھی درج ہی، اس خوبی و خوبصورتی اور حسن اہتمام سے شاید قرآن پاک کا کوئی حصہ کبھی ہندوستان مین طبع ہوا ہو،

"ز"

جلد ۳۱	ماہ محرم الحرام ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۳۳ء	عدد ۵

مضامین